یادوں کی برات

از : ———— جوشؔ ملیح آبادی

ضخامت : ———— ۷۵۲ صفحات

ناشر : جوش اکیڈمی ۲/۶ اکبر روڈ، پوسٹ بکس ۳۰۲۷، صدر کراچی ۳

"یادوں کی برات" ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی، اب ۱۹۷۲ء شروع ہو چکا ہے، راقم الحروف سے متعدد شاعروں، ادیبوں اور ارباب ذوق نے اصرار کیا کہ "فاران" میں اس کتاب پر تبصرہ آنا چاہیے، میں نے ان حضرات سے عرض کیا کہ جب تک ناشر یا مصنف کے دستخطوں کے ساتھ کتاب ہمیں نہیں ملے گی، ہم اس پر تبصرہ نہیں کریں گے۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تھی، انہی دنوں غالب لائبریری ناظم آباد میں "یادوں کی برات" کے چند ورق ادھر اُدھر سے الٹ کر دیکھے تھے، اب ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو جناب جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی کتاب پر اپنے قلم سے لکھا ہے :

"حضرت ماہرؔ لیجئے، بکرا حاضر ہے، شوق سے ذذبح[1] فرمایئے۔

سرِ دوستاں سلامت ......

جوش ۷۱/۱۲/۲۰"

۲۲ سال کی مدت میں ہمارے قلم سے ڈھائی ہزار سے بھی زائد کتابوں پر "فاران" میں تبصرہ ہوا ہے، جہاں تک ہمارے امکان میں تھا ہم نے ہر کتاب کو پورے غور و توجہ سے پڑھا اور دیانت کے ساتھ اس پر اپنی رائے کا اظہار کیا،

---

[1] "ذ" کو اسی طرح (مکرر) لکھا ہے۔

کسی مصنف، مترجم، مؤلف یا شاعر و ادیب کے ساتھ ہم نے زیادتی نہیں کی؛ ہر کتاب کے محاسن و معائب کے دونوں رُخ نمایاں کر دیے ہیں! متعدد اہلِ قلم اور مصنفین و شعراء نے نہ صرف یہ کہ ہماری تنقید کو گوارا فرمایا بلکہ اُن کمزوریوں کا جن پر ہم نے گرفت کی تھی کھلے دل سے اعتراف کیا۔ ہاں وہ حضرات جو صرف تحسین و ستائش کی توقع رکھتے تھے، وہ ہم سے ناراض ہو گئے! احتساب و تنقید کو گوارا کرنے کے لیے بڑے ظرف و تحمل اور دل گردے کی ضرورت ہے۔

"یادوں کی برات" کو ہم نے شروع سے آخر تک پڑھا، جناب جوش ملیح آبادی نے، کوئی شک نہیں اپنے قلم کی پوری قوت اس کتاب میں صرف کر دی ہے! یہ ایک مشاق اور عظیم شاعر کی خود نوشت سوانح عمری ہے جسے دلچسپ اور رنگا رنگ ہونا چاہیے! جہاں تک ہماری محدود معلومات کا تعلق ہے، دنیا کے کسی بڑے شاعر نے اس قدر شرح و بسط کے ساتھ اپنی زندگی کے حالات قلمبند نہیں کیے، اور پھر لکھنے والے نے ڈھکی چھپی ہر بات کسی جھجک، تکلف، اندیشۂ ملامت اور خوفِ رسوائی کے بغیر بیان کر دی ہے۔ جوش صاحب جنسی معاملات، ہوسناک واردات اور تجربوں کے اظہار میں شرم و غیرت کو بزدلی اور نامردی سمجھتے ہیں اس لیے "یادوں کی برات" اپنی جگہ "عریانی و برہنگی" کا کوک شاستر بن گئی ہے، کوکا پنڈت زندہ ہوتا تو اس برہنہ گوئی کی واقعی داد جوش صاحب کو دیتا!

وصل و ہم آغوشی کے ذکر و بیان میں جنسی جذبات کے لیے بڑی لذت اور کشش ہوتی ہے۔ کوئی شک نہیں اس لذت اور کشش کی اس کتاب میں فراوانی ہے! نوجوان لڑکیاں اور لڑکے ان رنگین و برہنہ مقامات کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس کریں گے جیسے ان کے جذبات میں کسی نے شتابہ لگا دیا۔ جوش صاحب نے، کوئی شک نہیں، ان مقامات پر نثر میں شاعری کی ہے مگر یہ نثریہ شاعری شہوانی جذبات کی خطرناک آتشبازی بھی ہے۔ اس آتش بازی سے اخلاق کے خس خانے بھک سے اڑ سکتے ہیں! دوسروں کے لیے اخلاق کی یہ آتش زدگی، کرب و اذیت کا سبب بن

سکتی ہے اور بننی چاہیے مگر جوشؔ صاحب کا تو یہ مشن ہے اور " اخلاق باختگی " اُن کی نگاہ میں انسانیت کا بہت بڑا شرف ہے۔

رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز
تا داد ز ہر کہتر و مہتر بستانی

طوائفیں اپنا کاروبار چمکانے کے لیے اپنی کمسن لڑکیوں کو جلد از جلد بالغ اور جنسی معاملات میں بے تکلف دیکھنا چاہتی ہیں۔ " یادوں کی برات " کے فحش و برہنہ مقامات ان " نوچیوں " کے کام کی چیز ہیں! علامہ اقبالؒ اپنے فرزند جاوید کو نصیحت فرماتے ہیں:

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

مگر جوشؔ کو سب سے زیادہ دشمنی حیا[1] اور غیرت سے ہے! اُن کا بس چلے تو ان الفاظ کو لغات اور ڈکشنریوں میں باقی نہ رہنے دیں یا اُن کے معنی بدل دیں!

جوشؔ ملیح آبادی کی نثر کے چند شہ پارے:

○ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، بچپن میں کیا تھا، شعلہ تھا، شبنم تھا، حدید تھا حریر تھا، نوکِ خار تھا کہ برگِ گل، خنجر تھا کہ ہلال، چنگیز خاں کا علمبردار تھا کہ " رحمۃ للعٰلمین " کا پرستار۔

میرے سینے کی تمام کھڑکیاں کھل گئیں۔ رگ رگ میں بشاشت کے فوارے چھٹنے لگے، نچلے ہونٹوں کے نیچے خشکی دوڑ گئی، آنکھیں جیسے ایک دم بڑی ہو گئیں، نگاہیں جھکیں تو اپنے چہرے کی سُرخی نظر آ گئی۔ پور پور میں تازگی انگلیاں چٹخانے لگی، میرے جسم کے اندر پو پھٹنے لگی اور سویرا ہو گیا۔

○ پھپانگی تلوار تھے تو وہ میٹھی چھری نکلے۔

---

[1] اذا لم تستحی فاصنع ما شئت (جب تجھ میں شرم و حیا ہی باقی نہیں رہی تو جو بھی جی میں آئے کہہ ڈال) (حدیث شریف)

○ چھت پر گیا تو نسیم صبح میری رضائی میں آکر مچلنے لگی، رونگٹے کھڑے ہوگئے، ایک طرب انگیز جھرجھری سے غنچۂ خاطر چٹک گیا۔ دل میں وہ راگنی چھڑ گئی جس کو انسانوں کے گلے یا ساز کے تار گرفت میں نہیں لا سکتے۔ دھندلکے نے اپنے گھونگھٹ کے پٹ کھول دیئے، ولولۂ نشاط نے مور کی طرح ناچنا شروع کر دیا۔ آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ دیکھا فضا کی محل سرا کے سیاہ پردے ایک ایک کرکے اٹھ رہے ہیں، لیلائے شب مستی کی دھڑی اور افشاں چھڑا کر اور رنگین آنچل سے کاجل پونچھ کر سرخ شلوکا پہن رہی ہے، سرمئی وادیوں میں مقیش کے خیمے نصب ہو رہے ہیں۔ افق کے ملگجے پردوں کے پیچھے ایک نیم روشن دائرۂ نور گھوم رہا ہے اور اس کے اردگرد ایک سنہرا ہالہ بنتا جا رہا ہے —— اور چند لمحوں کے بعد پھر یہ دیکھا کہ مشرق کا گریباں مسکنے لگا اور مسکتے مسکتے چرّے پھٹ گیا . . . . . .

○ میں کسی کی پروا نہیں کرتا تھا، صحن کے گوشے گوشے میں قلقاریاں مارتا، دھومیں مچاتا، اچھلتا، کودتا، دندناتا تالیاں بجا بجا کر " ہر سو رام دھڑکے سے " اور " کوڑی گئی ریت میں، پانی گیا کھیت میں " کے نعرے لگاتا پھرا کرتا تھا۔

○ میرا پاکستان آنا، ایسا معلوم ہوا گویا کوئی زبردست ڈاکو قارون کے خزانے پر لوٹ پڑا ہے۔ یا ابرہہ نے کعبہ کا محاصرہ کر لیا ہے۔ کام دیو اچھوتیوں کے محل میں کود پڑا ہے۔

○ پانی برس رہا تھا اور بڑے انداز سے پروائی سنک رہی تھی تو میرا ایک ملازم سالک رام[1] حضرت امیر مینائی کا یہ شعر لہک لہک کر گا رہا تھا۔

سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی لے گئی
وہ امنگیں مٹ گئیں وہ بلبلا جاتا رہا

---

[1] ہندوؤں کا نام " سالک رام " نہیں " سالگ رام " ہوتا ہے۔ (ماہر)

اس پر میں نے پوچھا کہ سالک رام یہ "بلبلا جاتا رہا" کیا کہہ رہے ہو، انہوں نے جواب دیا کہ بھیا! "جب ہم "بلبلا" کہت ہیں تو منہ کے اندر بڑا مجا (مزہ) آوت ہے ـــــ سو میرا ابھی اس وقت یہی عالم تھا کہ گانا سننے کے ساتھ جب مٹھائی کے کھلونے میرے منہ میں ٹوٹ ٹوٹ کر گھل رہے تھے تو مجھ کو اپنے منہ کے اندر بڑا "مجا" آ رہا تھا۔

○ ہائے! وہ چوک جو شبستانِ رنگ و بو تھا اب بھائیں بھائیں کر رہا ہے، جن کمروں میں پریاں رہتی تھیں، کالے[1] دیووں کو وہاں آباد کر دیا گیا ہے، جو فضا سارے گاما کے جھولوں میں جھولا کرتی تھی اب "اس پر" اے پائی (اے بھائی) جلبندھر سنگھا" اے ہانپچ (حافظ) کھدائی بکس (خدا بخش) کے نعروں کو سوار کر دیا گیا ہے، ہائے ہا! جن کوٹھوں پر زلفیں لہرایا کرتی تھیں وہاں ڈاڑھے چٹکارے جا رہے ہیں۔ جہاں طبلے گمکتے تھے وہاں خارپشتے کتے بھونک رہے ہیں، اور جہاں چاندنی رہا کرتی تھی وہاں دھوپ بسا دی گئی ہے۔

○ اے حرف ناشناس معلم، اے فاقہ کش رزاق، اے خلق کی برہانِ عظیم، اے امی حکیم، اے خدیوِ اقلیمِ حبل المتین، اے اولادِ آدم کی فتح مبین، اے ناموسِ ماء و طین، اے رحمۃ للعٰلمین! روحِ کائنات کا سجدۂ تعظیمی قبول فرما۔

○ میں دس کروڑ گھوڑوں کی طاقت کا انجن ہوں اور وہ (بیگم جوش) اس سے چوگنی طاقت کا بریک ہیں، اگر اس قدر قوی بریک نہ ہوتا تو میں اپنا انجن ہمالیہ سے ٹکرا کر اب تک کب کا پاش پاش کر چکا ہوتا۔

○ لیکن چونکہ میں بڑی تیزی کے ساتھ عزوب ہو رہا ہوں اور اس جھٹ پٹے میں اتنا وقت نہیں نکال سکتا، اس لیے ان کی زندگی کے چند پہلوؤں پر لکھ سکوں گا۔

○ اجی! آپ میرزا صاحب کو کیا سمجھتے ہیں کان کھول کر سن لیجیے کہ اس کرۂ ارض پر

---

[1] "کالے بھجنگے" لکھنا تھا۔ (ماہر)

معلومات کا اس[1] قدر بڑا کباڑی اور کوئی موجود ہی نہیں ہے۔

○ ان (کنور مہندر سنگھ بیدی) کے جدِ اعلیٰ تھے حضرت بابا گرو نانک جنھوں نے سکھ مت کی اس نیت سے طرح ڈالی تھی کہ ہندو اور مسلم کی دوئی مٹا کر ان میں وحدت پیدا کر دیں اور دو کو ایک بنا دیں، لیکن تاریخ کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ وہ دو کو ایک نہیں بنا سکے اور ان کی تمنا کے علی الرغم سکھوں کے اضافے کے بعد دو کے تین بن گئے۔

○ اس نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھا، اس کی نظر دل نے بات کی، میری نگاہوں نے جواب دیا، آنکھوں کی زبان اس قدر صاف، سلجھی اور دو ٹوک ہوتی ہے کہ غلط فہمی کا امکان ہی نہیں رہتا، آنکھوں کی بات چیت ہوا میں نہیں تیرتی، خون کی لہر دل میں ڈوب جاتی ہے ایک دل کہتا ہے، دوسرا سمجھ لیتا ہے۔

؎ نگاہے معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

جوش صاحب کے اس اندازِ بیان کی ہر صاحبِ ذوق تحسین کرے گا! جو اہلِ قلم زبان کے مزاج کے اصولوں اور نزاکتوں سے بے پروا ہو کر جو جی میں آتا ہے لکھ مارتے ہیں اُن کے لیے جناب جوش کا اسلوبِ نگارش "نمونہ" بن سکتا ہے کہ بات اس طرح سلیقہ کے ساتھ کہی جاتی ہے، اور لفظوں کو اس خوب صورتی کے ساتھ برتا جاتا ہے۔

اس کتاب میں لکھنؤ کے قدیم تمدن و تہذیب کی جھلکیاں ملتی ہیں، بہت سی معروف اور غیر معروف شخصیتوں کا اس کتاب کے ذریعہ تعارف ہوتا ہے مثلاً حکیم آزاد انصاری کو آج کون جانتا ہے؟ مگر "یادوں کی برات" بتاتی ہے کہ وہ کیا تھے؟

اس کتاب میں اردو کے ایسے بہت سے الفاظ محاورے اور کہاوتیں آگئی ہیں

---

[1] "آتنا" کا محل تھا (م۔ق)

جن کو آج کی نسل بڑی تیزی کے ساتھ بھولتی جارہی ہے۔ تیوہاروں، کھیلوں، مٹھائیوں، کھانوں، سواریوں، زیوروں اور کپڑوں وغیرہ کے ناموں کے اعتبار سے یہ کتاب معلومات آفریں بھی ہے۔ جوشؔ صاحب نے فارسی کے منتخب اشعار جا بجا نگینہ کی طرح جڑ دیئے ہیں۔

جوشؔ صاحب نے یہ کتاب اس قدر ریاضت، محنت، اہتمام، قصد وعزم اور خود اعتمادی کے ساتھ لکھی ہے۔ جیسے انہیں اس کا یقین ہے کہ اُن کی شاعری کی طرح اُن کی نثر نگاری کا بھی لوگ لوہا مان لیں گے:

مگر

اتنی سعی و کاوش کے باوجود "یادوں کی برات" میں زبان و بیان کی کمزوریاں اور لغزشیں بھی پائی جاتی ہیں!

اطرافِ جہات کو مرتب کرلوں ‏ ‏ روداد ِ حیات کو مرتب کرلوں
اس سے پہلے کہ بھول جائے سب کچھ ‏ ‏ یادوں کی برات کو مرتب کرلوں

اس رباعی کے پہلے مصرعے میں بڑا تکلف پایا جاتا ہے! جوشؔ صاحب غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ "لاؤ! میں اپنے ماحول کو مرتب کرلوں" یہ مصرع یوں ہوسکتا تھا:۔۔۔۔۔

ذات اور صفات کو مرتب کرلوں

دو رباعیوں کے بعد چار شعروں کا قطعہ ہے، فرماتے ہیں:۔

گلشنِ زیست کے ہر پھول کی رنگینی میں
دجلۂ خونِ رگِ جاں ہے کوئی کیا جانے

پھول کی رنگینی میں خونِ رگِ جاں کے "دجلہ" کا پایا جانا کتنا بے جا اور خلافِ واقعہ مبالغہ ہے! پھر موجِ خوں یا دجلۂ خوں، رگِ گل میں تو رواں دواں ہوسکتا ہے مگر "رنگینی" کے ساتھ اس کی نسبت عجیب سی لگتی ہے!

ماہنامہ "ساقی" کے "جوشؔ نمبر" میں راقم الحروف نے جنابِ جوشؔ کی شاعری

کے چار دَور پیش کیے تھے، اُن کی شاعری کی مثالوں کے ساتھ :

(۱) عروج (۲) اعادہ (۳) ٹھہراؤ (۴) پستی ! انہوں نے "یادوں کی برات" کے آغاز میں جو رباعیاں اور اشعار درج کیے ہیں وہ ان کے موجودہ دَورِ پستی کے نمونے ہیں ! (ہاں ! یہ ضرور ہے تین مہینے ہوئے جب میں نے کئی برس کے بعد اُن کی زبان سے ایک خاصی اچھی نظم سُنی تھی جیسے وہ اپنے دورِ عروج کی طرف واپس ہو رہے ہیں) -

"مورخانِ شباب کے شانے ہلائے" (صفحہ ۲۶) "تذکرہ نگارانِ شباب" زیادہ حسین اور موزوں ترکیب تھی۔

"اور ماضی سے اپنے کو جب ڈسوا چکا تو قلم کو خون میں ڈبو ڈبو کر سب کچھ قلم بند کر لیا۔" (صفحہ ۲۶) اس جملہ کا پہلا ٹکڑا (اور ماضی سے اپنے کو جب ڈسوا چکا) لفظ و معنی اور زبان و بیان ہر اعتبار سے محلِ غور ہے۔

"یہ عجیب کلیہ وضع فرمایا ہے کہ صرف اس موزوں کلام پر شعر کا "اطلاق" ہوگا جو "بالقصد" کہا گیا ہو — اگر یہ کلیہ تسلیم کر لیا جائے تو چونکہ میں نے آج کی تاریخ تک ایک مصرع بھی "بالقصد" موزوں کرنے کا ارتکاب نہیں کیا ہے ...." (ص۲۷)

یہ کلیہ بالکل درست ہے کہ شعر گوئی میں شاعر کے "قصد و ارادہ" کو دخل ہوتا ہے! بعض دوسری بے سر و پا باتوں کی طرح جن کو جوش صاحب نے "حقائق" سمجھ رکھا ہے، اُن کی یہ بات بھی مجذوب کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کہ انہوں نے "بالقصد" کوئی شعر ہی نہیں کہا ! حالانکہ اُن کی کتنی مسلسل غزلیں ہیں جو انہوں نے حافظ اور فارسی کے دوسرے شعراء کی غزلوں اور قصیدوں کو سامنے رکھ کر کہی ہیں! رباعی، نظم اور غزل یا مسلسل غزل میں بحر کا انتخاب، وزن کی پابندی، قافیہ اور ردیف کا التزام، پھر خیال کے اظہار کے لیے مناسب الفاظ کا استعمال، یہ تمام باتیں "بے مقصد و ارادہ" کیسے ہو سکتی ہیں! ہاں! یہ

ضرور ہے کہ جب شاعر کی طبیعت میں "آمد" کا جوش ہوتا ہے تو اس وقت بعض مصرعے یا اشعار اس طرح بے اختیار موزوں ہو جاتے ہیں کہ شاعر کو خود حیرت اور ساتھ ہی بے پناہ مسرت ہوتی ہے! مگر یہ بات سو فی صدی غلط ہے کہ جوش صاحب نے ایک مصرع بھی "بالقصد" نہیں کہا ۔ (ہاں! "وحی نبوت" میں نبی کے قصد و ارادہ کو دخل نہیں ہوتا) شاعر کے کلام میں تدریجی ترقی خود اس کا ثبوت ہے کہ مشاہدہ، مطالعہ اور مشق و تجربہ کے ساتھ اُس کا کلام بلند تر ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ سب کچھ شاعر کے قصد و ارادہ کے ساتھ ہی ظہور میں آتا ہے۔

"ممبر انتقاد کے خطیب" (صفحہ ۴۸۸) ممبر (Member تو انگریزی لفظ ہے، یہاں "منبر" ہونا چاہیے جس کی عربی جمع "منابر" ہے۔

"وہ شاخساروں کی گلخپ" (صفحہ ۸۰) صحیح املا "شاخسار" ہے اور "گلخپ" کے استعمال کا یہاں کوئی محل ہی نہ تھا!

"وہ بیر بہوٹیوں کی ہلچل" (صفحہ ۸۰) بیر بہوٹیوں کی کثرت کو "ہلچل" سے تشبیہ دینا، لکھنے والے کے ذوق کی کرختگی، مشاہدے کی خامی اور بیان و اظہار کی بے سلیقگی کی دلیل ہے۔

"گبھرو" (صفحہ ۳۰۴) زیادہ صحیح املا "گبرو" ہے!

"یہ ٹانگ کھولوں تو لاج وہ ٹانگ کھولوں تو لاج" (صفحہ ۱۸۷) یہ ضرب المثل غلط نہیں ہے مگر "ٹانگ" کی جگہ "گھٹنا" فصیح تر ہے یوں :-

"اپنا گھٹنا کھولیے اور آپ ہی لاجوں مریے"

اور

"یہ گھٹنا کھولوں تو لاج (مروں) اور وہ گھٹنا کھولوں تو لاج (مروں)" ٹانگ کے مقابلے میں "گھٹنے" کو ترجیح اس لیے حاصل ہے کہ عورت کی پنڈلی کے نیچے کا حصہ عام طور پر کھل جاتا ہے، مگر "گھٹنا" کھلنے سے ان بھی نظر آسکتی ہے اور یہ شرم (لاج) کی بات ہے۔

" اپنے رنگ کی طلاقت" (صہ ۵۰۵) طلاقت رنگ کی صفت ہے یا نطق و لسان کی ؟ ؟

جوشؔ صاحب نے اپنے نواسوں اور نواسیوں کے جو نام (عرف ولقب) رکھے ہیں، اُن سے جوشؔ صاحب کی خوش مذاقی پر حرف آتا ہے ؟

" مسٹر بھقاقا" ۔ " مسٹر پرپر" ۔ " وحشت کا چٹوغا" ۔ " مسٹر منیڈک" " مسٹر کپی" ۔ " قلنوا" اور " مسٹر کالا گڈون" ! اپنی لڑکی سعیدہ کا انھوں نے مردانہ نام " کلوا " رکھ کر نہ جانے کس صنعت کی رعایت رکھی ہے ! حالانکہ ان کی صاحبزادی کا رنگ کالا نہیں ہے (صفحہ ۳۹۱) ۔۔۔ یہ اگر شوخیِ طبع اور ذہن کی جدت ہے تو بد مذاقی اور دماغ کا عدم توازن کسے کہتے ہیں۔

" پنڈت جی نے کہا میں آپ کا بہت مشکور ہوں، میں نے کہا شاکر کہیے، ایسے مواقع پر مشکور غلط ہے" (صہ ۲۰۰)

جوشؔ صاحب کا پنڈت جواہر لال نہرو کو " مشکور " پر ٹوکنا حکمت کے خلاف تھا۔ ان کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ اردو روزمرہ میں غلط الفاظ بھی شامل ہو گئے ہیں ! بھارت میں اردو کی جان کے یوں ہی لالے پڑے ہوئے ہیں ! پھر اردو میں " مشکور " کا عام چلن ہو گیا ہے اور یہ اردو کا لفظ ہونے کی حیثیت سے بالکل صحیح ہے ! جوشؔ ملیح آبادی تو عربی زبان سے ناآشنا محض ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی (مرحوم) جو عربی زبان کے متبحر عالم تھے اُنھوں نے " مشکور " کو صحیح بتایا ہے ! جوشؔ صاحب " تابعدار " (ملازم کے معنی میں) اور " عرصہ " (بہ معنی مدت) کو غلط سمجھتے ہیں، اگر اس طرح اردو زبان کی خدانخواستہ تصحیح کی گئی تو اردو زبان کا بہت بڑا سرمایہ غارت ہو جائے گا ! اردو نے دوسری زبانوں کے لفظوں کے تلفظ اور معنی کو بدل دیا ہے، اردو زبان کی یہ خصوصیت اس کی آفاقیت، ہمہ گیری اور جامعیت کی دلیل ہے ! جوشؔ صاحب کو گرفت اور اصلاح ہی کرنی تھی تو " شاکر " کے بجائے " شکر گزار " کا لفظ پنڈت نہرو کو بتانا چاہیے تھا، اُردو میں اس معنی میں شکر گزار

یا متشکر بولا جاتا ہے "شاکر" نہیں بولا جاتا! روزمرہ یوں ہے — "ہم خدا پر شاکر ہیں" — یوں کوئی نہیں بولتا — "آپ نے مجھے قرض دیا میں آپ کا شاکر ہوں!"

جناب جوش مترادف الفاظ جمع کرنے کو شاید انشاپردازی کا کمال سمجھتے ہیں مگر اُن کا اندازِ نگارش پڑھنے والے کے اندر اکتاہٹ اور بدمزگی پیدا کر دیتا ہے، لکھتے ہیں:

"اودھو جھومتی جھمکتی، جھر جھراتی، جھم جھماتی، جھم جھم برستی، جوبن والی جوبنٹی برسات، گھپ اندھیروں اور گھنگھور گھٹاؤں کی چھاؤں میں گھرتی، گھومتی، گھماتی، گنگناتی گمکتی، گاتی، گرجتی، گونجتی، گھڑگھڑاتی، گھونگر دالی برکھا۔

آسمان کو گھماتی، زمین کو نچاتی، فضا کو جلاتی، شمس و قمر کو گہناتی، چوپائے کو تھپتھپاتی، طوفانوں پر طوفان اٹھاتی، زلفیں جھٹکاتی، کجریاں سناتی، کھیتیاں لہلہاتی......" (صفحہ ۹)

○ ماہ رو، سوسن خو، گبھرو، لچکیلا، چھریرا، چٹکتا، مدھ بھرا. بانکا، ترچھا، نکیلا، پٹھا، رسیلا، چھبیلا، سجیلا، سانولا، سلونا اور سہانا جاڑا (صفحہ ۷)

○ ارے بھیجے ستے منہ کا موسم گرما — دھوپیا، زندگیا، دمکاریا، پسنیا، پھوڑیا، بھاڑیا، بھنبھوڑیا، تنوریا، جنگاریا — اکل کھرا، جل لکڑا، گھننا — روڑھا، بڑ دتا، سبڑا، ہیڑا، بھینگا (صفحہ ۵)

ہماری گاڑی سینکڑوں کھڑی ہوئی گاڑیوں کی قطاروں کے درمیان سے گھڑ گھڑم، شائیں، شائیں کرتی اور صدہا لائن بدلنے والی اتصالی پٹریوں کو قچ قچ قچاک، کھچ کھچ کھچاک اور کٹ کٹ کٹاک کاٹتی — الالائیں، الجبرائیں، شائیں شائیں، غائیں غائیں،

دھڑام دھڑام اور ڈھوم ڈھوم اور ڈھائیں (صفحہ ۹۷-۹۸)
جوشؔ صاحب کی "صوتیاتی جدت" اور مترادفات کی بھرمار نے بچاری انشاپردازی کا حلیہ بگاڑا ہے۔

"دودھ دہی کی ہانڈیوں، مٹھائیوں اور رساول کی بڑی بڑی لٹیوں کا ایک انبار لگ گیا۔" (صفحہ ۶۵)

"لٹیوں" کے بجائے "ٹھلیوں" لکھنا تھا! لُٹیا پیتل کی بنی ہوئی ہوتی ہے اور "ٹھلیا" مٹی کی! شہروں اور قصبوں میں اور خاص طور سے گاؤں میں رساول کے لیے (مٹی کی بنی ہوئی) ٹھلیاں استعمال ہوتی ہیں[1]۔

صفحہ ۱۰۲ پر "صبح" کو اُبلی، اُبلی، سیٹھی سیٹھی اور اوندھی اوندھی کہا گیا ہے۔ یہ زبان کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہے۔

"جب اس قتالۂ عالم نے رقص کرنے کے لیے اپنے ترشے ہوئے کولھے کے دل فریب کٹاؤ پر" (صفحہ ۱۱۴)

ستونوں، محرابوں اور جالیوں کے لیے تو "کٹاؤ" کا لفظ بولتے اور لکھتے ہیں مگر انسانی جسم کی خوبصورتی کے بیان میں "کٹاؤ" کا استعمال بے ذوقی کی دلیل ہے۔

"اس کی جوانی کا سبب ہنوز پال سے نہیں نکالا گیا۔" (صفحہ ۱۱۵)

جوانی کا سبب پھر اس کا "پال میں رکھ کر نکالا جانا" یہ خیال اور اظہار دونوں وجدان پر کتنے گراں گزرتے ہیں! سوچنے کا یہ انداز ذوقِ جمال کو کس قدر کھلتا ہے۔

"کولھے کے دلفریب کٹاؤ پر بایاں ہاتھ رکھ کر چھلاّ سی کمر لچکائی تو ایسا نظر آیا گویا رقص کی دیوی کی سنہری رتھ کا دُھرا بڑی لچک کے ساتھ گھوم رہا ہے"(صفحہ ۱۱۴)

---

[1] انگریز لغت نویس Jonn T.Platts لٹیا اور ٹھلیا کی ساخت اور ماہیت کے اس فرق سے واقف ہے مگر اودھ کے رہنے والے شاعرِ انقلاب کو اس کا پتا نہیں!

اس انداز بیان میں کس قدر آورد اور کتنا تکلف پایا جاتا ہے! اس قسم کی عبارتیں جو ادبی لطافت سے عاری ہیں کتاب میں ملتی ہیں۔

" پاؤں میں چھاگل اور جھانجھیں" (ص ۲۰۱)

جھانجھ (یا جھانج) تو ایک قسم کا بڑا مجیرا ہے جو تاشے اور ڈھول کے ساتھ بجایا جاتا ہے۔ (نوراللغات) عورتیں پیروں میں جھانجھ نہیں "جھانجن" پہنتی ہیں ——!

" لاہور میں ان خبروں کا ابطال شائع کرا کے۔" (صفحہ ۲۰۰)

حیرت ہے کہ روزمرہ کے لفظ " تردید" کو چھوڑ کر جوش صاحب " ابطال" استعمال فرماتے ہیں!

" ظاہر ہے کہ ,, Mass Production یعنی وافر پیداواری، تکثر آفرینی یا انبار ابداعی میں بڑھیا مال تو پیدا ہو نہیں سکتا۔ (ص ۳۴۴)

اس جناتی زبان کو جو ثقیل بھی ہے اور غریب و نامانوس بھی ہے کیا کہا جائے؟

" اس کے نکیلے چہرے کی موج ہائے رنگ رنگ سے نکل نکل کر ایک سنہرا آنکڑا بار بار میری طرف آتا ہے۔ (ص ۲۰۰)

لفظ " آنکڑا " نے پوری عبادت کو اس منظر کو اور لڑکی کے حسن و جمال کی شرح و تفصیل کو وجدان و ذوق کے لیے تکلیف دہ بنا دیا —— توبہ! " چہرے" کو نکیلا کہنا بھی عجیب سا لگتا ہے اور یہ لفظ انہوں نے بار بار استعمال کیا ہے۔

" عورت ڈھیٹ تھی ڈری نہیں اور بانکے سپہیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی..... تم ڈاکو ہو، اچھال چھکا ہو۔" (ص ۶۸) —— حالانکہ " اچھال چھکا" مرد کے لیے نہیں عورت اور صرف بدچلن عورت کے لیے بولا جاتا ہے

" میرا نکاح..... بڑی ضدم ضدا اور چوٹم چاٹا کا نکاح تھا۔" (ص ۱۳۱)

" چوٹم چاٹا" یہ کہاں کی زبان ہے

" گھانس کھا گئے ہو یا مجھے چنڈھلا رہے ہو۔" (ص ۷۰) " چنڈھلانا" یا

"چندھیانا" تو آنکھوں کے خیرہ ہونے کے معنی میں بولا جاتا ہے، تجاہل عارفانہ کے لیے "چندرانا" بولتے ہیں! اگر پوربی قصبات میں بولا بھی جاتا ہو تو فصیح "چندیانا" ہے اور کتاب "انشاء" کی زبان ہے۔

"میں نے کہا اپنی دکان کے ایک گوشے میں اوٹ کھڑے کردو" (ص ۴۱۲)

"اوٹ" مذکر نہیں مونث ہے[1]!

"ڈغدڑغا کر کٹورا" بھر پانی پیتیا (صفحہ ۲۱۶) صحیح املا "ڈگڈگانا" ہے!

صفحہ ۸، پر "چھیریرا" کا "چھرہرا" املا کیا گیا ہے، "جگار" کو "جگاہر" (صفحہ ۲۲۷) لکھا ہے —— اور "ملائمت" کو ہر جگہ "ملائمیت"! (ص ۱۰۱)

اور "ماموں کو" "مامنوں"!

"وہ دوب کا مخمل" (ص ۸) "مخمل" کو بعض شاعروں نے مذکر بھی باندھا ہے۔ مگر عام طور پر یہ لفظ مونث بولا جاتا ہے

"وہ انتہائی عقیدت کے ساتھ مکالمت کرتے رہے" (ص ۴۲۷) اس طرح کون بولتا ہے؟

"خارشیے کتے" (ص ۱۰۵) ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو کہ "خارشتیے" کے بجائے "خارشیے" چھپ گیا۔

علی گڑھ کی نمائش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ہم پشاوری پراٹھے کباب اور خورجے کی چٹنی کھا کر نکلے" (ص ۱۵۵)

نورتن چٹنی تو مارہرہ کی مشہور رہی ہے، علی گڑھ کی نمائش میں خورجہ کی جو دکان لگتی تھی وہ شلجم کے اچار کی دکان تھی!

"میری چشم تصور نے یکایک پھر یہ تماشا دیکھنا شروع کر دیا کہ یزید، شمر، نادر، نیرو، چنگیز، ہلاکو، مسولینی اور ہٹلر خونِ انسانی کے دریاؤں میں اپنی رنگینیوں کے جہاز

---

[1] کی جو شرما کے اوٹ پردے کی (انشاء)

چلا رہے ہیں۔" (ص۱۸۵) ——— اس عبارت میں اوّل تو لفظ "رنگینیوں" کا بے محل استعمال ہوا ہے۔ دوسری بات یہ کہ شمر، نادر، چنگیز، ہلاکو اور ہٹلر کی زندگیاں رنگینی اور عیش و طرب میں شہرت نہیں رکھتیں، پھر ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں جس زمانہ کی جوش صاحب داستان سنا رہے ہیں مسولینی اور ہٹلر بین الاقوامی شہرت و اقتدار کے اسٹیج پر کہاں آئے تھے!

ص۱۹۹ پر جوش صاحب نے مٹھائیوں کے نام لکھے ہیں ان میں زردہ، مزعفر، کھیر اور شیر خرما ——— کو بھی شامل کر دیا ہے، ان کھانوں کو "مٹھائی" میں نہیں "میٹھے" کی فہرست میں شامل کرنا چاہیئے! مثلاً لڈو مٹھائی ہے اور کھیر "میٹھا" ہے۔

"...... قاضی (خورشید احمد) نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے سبحان اللہ کا ایسا نعرہ لگایا کہ مہاراجہ یہ سمجھ کر کہ نظام دکن تشریف لے آئے ہیں، دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔" (ص۲۴۲)

راقم الحروف کی مہاراجہ کشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ کے دربار سے تیرہ سال کے قریب وابستگی رہی ہے، مہاراجہ بہادر کے یہاں ایک صاحب گراں گوش تھے، جن کو سب "بہرے نواب" کہتے تھے، "بہرے نواب" سے مہاراجہ بہادر کے دربار میں ہر شخص بلند آواز سے بات چیت کرتا تھا! دوسرے صاحب تھے حکیم محمد ابراہیم جو طبیہ کالج کے پرنسپل تھے، وہ بھی ادبی لطیفے شاعرانہ چٹکلے اور علمی نکات خاصی کراری آواز میں بیان کرتے تھے! قاضی خورشید احمد کے نعرے کو سن کر مہاراجہ بہادر کا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جانا کہ نظام دکن تشریف لے آئے ——— یہ جوش صاحب کا گھڑا ہوا لطیفہ ہے، جس کی کوئی اصلیت نہیں۔

حکیم صاحب عالم کا ذکر کرتے ہوئے جوش ملیح آبادی رقمطراز ہیں:۔

"وہ اس بلا کے نکتہ سنج تھے کہ اچھا شعر سن کر جھومنے اور سر دھننے لگتے تھے اور ایک بار تو میری نظم سن کر ان کا یہ عالم ہو گیا کہ انتہائی

مہذب ہونے کے باوجود وہ جست کرکے میری چھاتی پر چڑھ بیٹھے اور
میرا گلا دباکر چیخنے لگے تھے کہ آج تجھے مار ڈالوں گا۔" (ص ۴۵۰)

یہ بھی "تصنیفِ بندہ" سے ——— اس قسم کی داد کسی صاحبِ ہوش اور اہلِ عقل سے متوقع نہیں ہو سکتی! انہی حکیم صاحب کی تعریف جوش صاحب نے ان لفظوں میں کی ہے:

"لکھنؤ کے حاذق و ممتاز طبیب، عربی و فارسی کے منتہی، مذہبی قصائد کے عدیم النظیر شاعر خوش وضع، خوش طبع، خوش فکر......."

کیا اس رکھ رکھاؤ اور قابلیت و ذوق کا آدمی ایسی مذبوحی حرکت کر سکتا ہے کہ اچھی نظم سنتے ہوئے شاعر کو پچھاڑ کر اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھے اور گلا دبا کر دھمکی دے کہ تجھے مار ڈالوں گا ——— حکیم صاحب کی تعریف میں مبالغہ کا یہ رنگ بھی دیکھنے میں آیا ———

"مملکتِ شرافت کے تاجدار، اقلیمِ خلوص کے شہریار، کاروانِ زہد و اتقا کے سالار"

یہ مدح و منقبت ائمہ اہل بیت اور صحابہ کرام کو زیب دیتی اور ان نفوسِ قدسیہ کو سجتی ہے۔

"مہاراجہ سے ملا کر میں نے اُن (یعنی فانی بدایونی) کی ملازمت کی سبیل نکال دی، اور وہ کسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے اور قیس عامری نے معلم کا لباس پہن لیا، لیکن معلمی زیادہ دن چلی نہیں اور جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے تو مہاراجہ کشن پرشاد نے اُن کا وظیفہ مقرر کر دیا۔" (ص ۵۰۳)

اس عبارت میں جوش صاحب نے کئی جھوٹ بولے ہیں! فانی بدایونی کی ملازمت کا جوش صاحب سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ فانی ان معاملات میں جوش صاحب کے شکوہ سنج تھے! یہ بھی غلط ہے کہ فانی صاحب سے معلمی

زیادہ دن چلی نہیں، حضرت فانی نے بڑی قابلیت کے ساتھ ہیڈ ماسٹری کے فرائض انجام دیئے۔ نظامت تعلیمات نے بلدہ حیدرآباد سے کسی ضلع میں اُن کا تبادلہ کر دیا تھا۔ فانی نے رخصت لے لی، وہ بلدہ حیدرآباد سے باہر ملازمت پر نہیں گئے۔ ڈیڑھ دو سال رخصت پر رہے یہاں تک کہ ملازمت سے علیحدگی کی نوبت آئی۔ اور تیسری بات کی صحیح صورت یہ ہے کہ جب فانی آگرے سے (غالباً ۱۹۳۱ء میں) حیدرآباد آئے تھے تو آنے کے چند مہینہ بعد مہاراجہ بہادر نے ان کا تین سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر فرما دیا مگر جب مہاراجہ بہادر کے حکم سے فانی کو محکمہ تعلیمات میں ملازمت مل گئی تو کچھ مدت بعد مہاراجہ بہادر نے وظیفہ بند کر دیا۔

"(ڈاکٹر اشرف الحق) مولوی عبدالحق محدث دہلوی کے پوتے مولوی نذیر احمد مفسر قرآن کے نواسے۔ (صفحہ ۵۲۲)

عبدالحق محدث دہلویؒ کو "مولوی" کوئی نہیں کہتا وہ "شیخ" کے لقب سے شہرت رکھتے ہیں اور نذیر احمد کے نام کے ساتھ مولوی نہیں "ڈپٹی" لکھا جاتا اور ڈپٹی نذیر احمد نے قرآن کریم کا ترجمہ کیا ہے، تفسیر نہیں لکھی؛ وہ مترجم تھے مفسر قرآن نہیں تھے۔ ڈاکٹر اشرف الحق ڈپٹی نذیر احمد کے نواسے تو تھے مگر وہ شیخ عبدالحق دہلویؒ کے بیٹے کے بیٹے (یعنی پوتے) نہ تھے۔ ہاں! اُن کی نسل سے تھے اور شیخ عبدالحقؒ اور ڈاکٹر اشرف الحق کے درمیان تین صدیوں سے بھی زاید فصلِ زمانی تھا۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی تعریف میں جوش صاحب لکھتے ہیں:

"اُن کا وجود ہندوستان کا افتخار، ایشیا کا وقار اور عالمِ انسانیت کا اعتبار تھا۔" (صفحہ ۵۲۹)

"عالمِ انسانیت کا اعتبار" اس نعت و منقبت کے سزاوار تو انبیاء کرامؑ ہیں! آگے چل کر فرماتے ہیں: ——

"اور وہ اس عالمِ اجسام کے ایک ایسے ذی حیات تاج محل تھے،

زیادہ دن چلی نہیں! حضرت فانی نے بڑی قابلیت کے ساتھ ہیڈ ماسٹری کے فرائض انجام دیئے! نظامتِ تعلیمات نے بلدہ حیدر آباد سے کسی ضلع میں ان کا تبادلہ کر دیا تھا۔ فانی نے رخصت لے لی، وہ بلدہ حیدر آباد سے باہر ملازمت پر نہیں گئے۔ ڈیڑھ دو سال رخصت پر رہے یہاں تک کہ ملازمت سے علیحدگی کی نوبت آئی! اور تیسری بات کی صحیح صورت یہ ہے کہ جب فانی آگرے سے (غالباً ۱۹۳۱ء میں) حیدر آباد آئے تھے تو آنے کے چند مہینہ بعد مہاراجہ بہادر نے ان کا تین سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر فرما دیا مگر جب مہاراجہ بہادر کے حکم سے فانی کو محکمہ تعلیمات میں ملازمت مل گئی تو کچھ مدت بعد مہاراجہ بہادر نے وظیفہ بند کر دیا۔

"(ڈاکٹر اشرف الحق) مولوی عبدالحق محدث دہلوی کے پوتے مولوی نذیر احمد مفسرِ قرآن کے نواسے۔ (صہ ۵۲۲)

عبدالحق محدث دہلویؒ کو "مولوی" کوئی نہیں کہتا وہ "شیخ" کے لقب سے شہرت رکھتے ہیں اور نذیر احمد کے نام کے ساتھ مولوی نہیں "ڈپٹی" لکھا جاتا اور ڈپٹی نذیر احمد نے قرآنِ کریم کا ترجمہ کیا ہے، تفسیر نہیں لکھی! وہ مترجم تھے مفسرِ قرآن نہیں تھے۔ ڈاکٹر اشرف الحق ڈپٹی نذیر احمد کے نواسے تو تھے مگر وہ شیخ عبدالحق دہلویؒ کے بیٹے کے بیٹے (یعنی پوتے) نہ تھے۔ ہاں! اُن کی نسل سے تھے اور شیخ عبدالحقؒ اور ڈاکٹر اشرف الحق کے درمیان تین صدیوں سے بھی زاید فصلِ زمانی تھا۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی تعریف میں جوش صاحب لکھتے ہیں:

"اُن کا وجود ہندوستان کا افتخار، ایشیا کا وقار اور عالمِ انسانیت کا اعتبار تھا۔" (صفحہ ۵۲۹)

"عالمِ انسانیت کا اعتبار" اس نعت و منقبت کے سزاوار تو انبیاء کرام ہیں! آگے چل کر فرماتے ہیں:

"اور وہ اس عالمِ اجسام کے ایک ایسے ذی حیات تاج محل تھے،

جس کو شامِ اودھ کی ملاحت اور صبحِ بنارس کی صباحت نے الہ آباد
کے معنی خیز سنگم پر، گنگا جمنی چھینیوں سے تراش کر تعمیر کیا تھا۔"

ملاحت اور صباحت سے چھینیوں کے تراشنے کی نسبت ملاحت و صباحت کی
لطافت کے ساتھ ظلم ہے!

"(منشی احمد علی شوق) اپنا کلام سنانے لگے، اور خدا جھوٹ نہ
بلوائے تو ایک سانس میں ساٹھ ستر غزلیں سنا ڈالیں۔" (صـ ۶۶۴)

ایک سانس میں ساٹھ ستر غزلیں کون سنا سکتا ہے؟ چار گھنٹے تک کسی وقفہ کے
بغیر کسی شاعر کا غزلیں سنانا اور دوسرے آدمی کا سُننا عجوبہ سے کم نہیں!
جوش صاحب ساٹھ ستر کی جگہ دس بارہ غزلیں بھی کہہ سکتے تھے، مگر اسے کیا
کیجیے کہ اُن کے قلم کو غلط بیانی اور مبالغہ آرائی کا ہوکا ہو گیا ہے۔ اصل واقعہ کو
وہ نمک مرچ لگا کر کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں! وہ شاید ساری دنیا کو بے وقوف سمجھتے
ہیں انہیں اس کا دھیان ہی نہیں رہتا کہ ان کے قلم سے کیا نکل رہا ہے۔ اور وہ
واقعیت، حقیقت اور فطرت سے کس قدر بعید ہے۔

مولانا عبدالسلام (صـ ۵۵۳) کے نام کے ساتھ "نیازی" ضرور لکھنا
تھا، وہ اسی سلسلۂ طریقت کی نسبت کے ساتھ مشہور تھے! مولانا مرحوم کی جوش صاحب
سے جو ملاقاتیں رہی ہیں تو دلی میں یہ روایت راقم الحروف کے کانوں تک پہنچی
ہے کہ جوش صاحب نے ذاتِ باری کے متعلق مولانا عبدالسلام نیازی سے سوال
کیا، انہوں نے معقول انداز میں جواب دیا، جوش صاحب نے پھر چھیڑ خانی کی،
اس پر مولانا مرحوم نے فرمایا: ——————

"جوش! تیرا دماغ شیطان کی کھڈی ہے"

اس روایت اور واقعہ کو جوش صاحب گول کر گئے۔

جوش ملیح آبادی نے اپنی عشقبازی، تماش بینی اور ہوسناکی کے جو واقعات
لکھے ہیں، ان میں واقعیت سے زیادہ افسانہ اور ناول کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش

کی ہے، اول تو جس مرد اور عورت سے ان کا واسطہ پڑتا ہے وہ لازمی طور پر خوروش، پری پیکر مجسمۂ حسن و خوبی، منتخب روزگار اور چندے ماہتاب اور چندے آفتاب ہے! حسن و جمال کی اس شرح و تفصیل میں جناب جوشؔ نے زیبِ داستان کے لیے نہ جانے کتنے اضافے کیے ہیں اور کہاں کہاں واقعات کا جوڑ اپنی شوخیٔ تخیل سے ملایا ہے! کوئی عورت اُن کے فراق میں زہر کھاتی ہے، کوئی سمندر میں ڈوب جانے کے لیے چھلانگ لگاتی ہے اور کوئی دل پھینک خاتون اپنی کلائی دانتوں سے لہولہان کر کے جوشؔ صاحب کے گٹے پر اپنا خون اس لیے چسپاں کرتی ہے کہ جوشؔ صاحب کے خون سے میرا خون مل جائے (صفحہ ۲۳۶)

ط، ج کے معاشقہ کے افسانہ (ص۱۷۱) کا پلاٹ جوشؔ صاحب نے نہ جانے کس سرخوشی کے عالم میں مرتب فرمایا ہے کہ اُسے پڑھ کر دل کہتا ہے اور عقل بول اٹھتی ہے کہ شاعرِ انقلاب نے یہ نری شاعری فرمائی ہے، اپنی محبوبہ کے مکان میں جانے کے لیے دربان سے کہتے ہیں:

"اُدھر چلو ہم اس پہاڑی کے ذریعے اس کوٹھی کی چھت پر چڑھ جائیں گے وہاں پہنچ کر تم میری کمر سے رسی باندھ کر مجھے اس طرح انگنائی میں اتارنا[1] جیسے کنوئیں میں ڈول ڈالا جاتا ہے ......" (ص۱۷۲)

کنوئیں کے ڈول کی طرح کسی آدمی کو مکان کی چھت سے آنگن میں اتارنا عقل میں نہیں آتا اور جس آدمی کو کمر میں رسی باندھ کر مکان کے صحن میں ڈول کی مانند اتارا جائے گا وہ اس طرح چوٹ لگنے اور لہولہان ہونے سے بچ نہیں سکتا! ہاں یہ لکھتے کہ دربان نے چھت کی منڈیر میں خوب کس کر رسی باندھ دی تھی اور میں اُس رسی کے سہارے آنگن میں اتر گیا تو ٹھکانے کی بات تھی! میں یہ بات اپنے تجربہ کی بنا پر

---

[1] وہ جو قصے کہانیوں میں کمند و بام کے واقعات ملتے ہیں جوشؔ صاحب نے اپنے رومانس کا اسی سے جوڑ ملایا ہے، مگر بے ڈھنگے طریقہ سے (م۔ق)

کہہ رہا ہوں کہ گاؤں میں رسی کے سہارے پیڑوں پر چڑھنے اور اترنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور گاؤں کے لوگوں کو رسی کے سہارے لٹک کر کنوئیں میں اترتے بھی دیکھا ہے۔

اچھا! جوشؔ صاحب کی بات ہی صحیح مان لیجیے۔ انہیں واقعی اس ہیئت سے اُن کی محبوبہ کی کوٹھی کے بالائی حصہ سے صحن میں اُتارا گیا تھا ـــــ مگر پھر کیا ہوتا ہے :-

"داہنے طرف کے مکان میں ایک عابد شب زندہ دار اوراد پڑھ رہا تھا" (ص۲۲۴)

اور ٹیپ کا بند تو یہ ہے ـــــ جسے پڑھئے اور شاعرِ انقلاب کے افسانہ طراز اور حکایت ساز دماغ کی داد دیجئے۔

"........ لیکن میں ہمت نہیں ہارا جب رینگتا رانگتا منڈیر کے قریب پہنچ گیا تو ایک کالا سانپ عین میرے منہ کے سامنے کھڑا ہو کر پھنکاریں مارنے لگا ...... در بان دور ہٹ کر بیٹھ گیا اور سانپ کے پھنکاروں کی ہوا میرا ماتھا چھونے لگی .... میں اسی طرح دو تین منٹ تک یقینی موت کے سامنے بیٹھا رہا، اتنے میں پھنکار کی آواز بند ہو گئی، میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر جان میں جان آگئی کہ ناگ دیوتا رخصت ہو چکے تھے۔" (ص۲۲۳)

جوشؔ صاحب نے اپنی خاندانی امارت بلکہ یوں کہیے نوابی کا اس قدر شدومد کے ساتھ ذکر کیا ہے جیسے اُن کے باپ دادا اودھ کے زمیندار نہیں کسی اسٹیٹ کے فرمانروا اور والیٔ ملک تھے اور ان کے خاندان کی جائیداد اور آمدنی رام پور اور بنارس کی ریاستوں کے لگ بھگ تھی!

"میری حویلی کی اندرونی فضا ـــــ ہر طرف روشنی تھی، رنگینی تھی، چہل پہل تھی ـــــ لونڈیاں، باندیاں، مامائیں، اصیلیں، مغلانیاں، انائیں، دوائیں، کھلائیاں ـــــ استانیاں، پنکھوں کی ڈوریاں کھینچنے والیاں، راتوں کی کہانیاں سنانے والیاں، چاروں طرف

چلتی پھرتی تھیں ......" (ص ۲۲)

جوش صاحب آغا حیدر حسن دہلوی کا کوئی مضمون پڑھ لیتے تو ان نوکرانیوں کی اس فہرست میں "قلماقنیوں، اُرداؔ بیگنیوں ....." وغیرہ کا بھی اضافہ فرما سکتے تھے۔

اس "الف لیلہ" کا ایک اور ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے ——

"بیرونی فضا —— رکاب داروں، فراشوں، سپاہیوں، مولویوں، سائیسوں، مصاحبوں، داستان گویوں، منشیوں، مثلح داروں اور کارندوں کا ہر طرف ایک ہنگامہ سا برپا رہتا تھا۔" (ص ۲۲)

لگے ہاتھوں —— چلم بھرنے والوں، پہرہ داروں، شہنائی بجانے والوں، ڈوم ڈھاڑیوں، جمعداروں، برقندازوں، کوچبانوں، مہاوتوں، مشعلچیوں، خانساماؤں، چھتری برداروں، شاگرد پیشوں، عرض بیگیوں اور توشک خانہ کے کارپردازوں کے نام بھی اس فہرست میں شامل کر دیتے! تو یہ فہرست زیادہ متنوع اور طویل ہو جاتی، جب جھوٹ ہی بولنا ٹھہرا تو خوب ڈٹ کر بولنا چاہیئے۔

"کم و بیش ڈیڑھ سو اقربا و احباب اور ملازمین ہمارے یہاں روز افطار کیا کرتے تھے۔" (ص ۸۰)

جوش صاحب نے اپنے یہاں کے نوکروں اور نوکرانیوں کی جو فہرست نقل فرمائی ہے، اتنی تعداد میں مختلف پیشوں، کام اور خدمت کے نوکر کسی والیٔ ریاست ہی کے یہاں ہو سکتے ہیں! راجہ صاحب محمود آباد جن کی سالانہ آمدنی تیس لاکھ روپیہ تھی اُن سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے یہاں کتنی کہانی سنانے والیاں اور کتنے داستان گو ملازم تھے؟

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہمارے یہاں کسی کا ناخن دکھتا تو گھر ڈاکٹروں سے بھر جاتا؟ کیا قصبہ ملیح آباد میں اتنے بہت سے ڈاکٹر مل سکتے تھے؟ بادشاہوں کے یہاں بھی سننے میں نہیں آیا کہ کسی شاہزادے یا شہزادی کے ناخن دکھنے یا کان گرم ہو جانے پر اتنے طبیب بلائے گئے ہوں کہ شاہی محل طبیبوں سے بھر گیا ہو۔

"(جوشؔ صاحب کے دادا نے کہا) لے یہ دو گنیاں اس کی مٹھائی کھانا، اور اس میں سے پانچ روپے غلام زادے کو دینا جس کو تو ابھی مار رہا تھا۔" (ص ۴۹)

یہ ساٹھ سال سے بھی پہلے کی بات ہے جب ایک روپیہ کی بڑھیا مٹھائی چار سیر کے قریب آتی ہو گی! دو گنیوں کی مٹھائی دو من کے قریب سمجھ لیجئے! اس زمانہ میں نوکروں کی تنخواہ کھانے کپڑے کے ساتھ ڈیڑھ دو روپیہ سے زاید نہیں ہوتی تھی! غلام زادوں کو پانچ روپیہ انعام کون دیتا تھا؟

نواب ممتاز الدولہ مکرم علی خاں مرحوم جو نواب سر فیاض علی خاں وزیر اعظم جے پور اور رئیس اعظم پہاسو کے پوتے تھے، وہ اپنے بچپن کے قصے سنایا کرتے تھے کہ ہمارے دادا جمعہ کے جمعہ ایک ایک آنہ ہم دو بھائیوں کو دیا کرتے تھے۔ نواب سر فیاض علی خاں خسیس نہیں تھے، اب سے ساٹھ ستر سال قبل ایک آنہ کی بڑی قیمت تھی اور دس بارہ برس کی عمر کے بچوں کو روپے اور گنیاں بڑے بڑے زمیندار اور تعلقدار بھی نہیں دیتے تھے! اور فقیروں، مانگنے والوں اور بھکاریوں کو دو چار پیسے دینا بھی بہت کچھ سمجھا جاتا تھا مگر جوشؔ صاحب لکھتے ہیں:۔

"-----اماں! ہمارے دروازے پر جوگی کھڑے ہوئے ہیں، انہیں بھیک دے دو، میری ماں کو، میری اس ادا پر بہت پیار آتا تھا، وہ بٹوے سے نکال کر دو روپے میرے حوالے کر دیا کرتی تھیں۔"

جوشؔ صاحب کے والد بزرگوار کے یہاں بٹیر پالنے پر سپاہی مامور تھے (ص ۵۲) نہ جانے مرغیاں پالنے اور کبوتر اڑانے والے ملازموں کا ذکر کیسے چھوٹ گیا، شاید اس کا سبب انکسار ہو! ہاں! بندہ علی خاں جو بٹیر پالنے پر مامور تھا اُسے جوشؔ صاحب کے والدِ محترم نے چھ سو روپیہ لڑکی کے بیاہ کے لیے عطا فرمائے تھے! بندہ علی وہ روپیہ جوئے میں ہار گیا۔ اس زمانہ کا چھ سو روپیہ آج کے پچیس تیس ہزار کے برابر ہے مگر بندہ علی خاں کسی بنئے بقال یا معمولی زمیندار کا نہیں

جوشؔ صاحب کے نوابی خانوادے کا ملازم تھا جہاں پیسہ کنکری کی طرح لٹتا تھا اور دولت پانی کی مانند بہتی تھی! جوشؔ صاحب نے بندہ علی خاں پر ترس کھا کر اپنی والدہ کی تین ہزار روپیہ کی چمپا کلی اپنے ملازم کو دے دی اور جب اُن کی ماں کو بیٹے کی اس سخاوت کا علم ہوا تو ان کے دل کی کلی کھل گئی اور جوشؔ صاحب کو انہوں نے دعائیں دیں! (صفحہ ۵۲، ۵۳)

جوشؔ صاحب کا دولت خانہ —— (جس میں)

"چاندنی پر زریں قالین، مخمل کے گاؤ تکیے، سنگِ مرمر کے میز فرش میزوں پر گلدان، ادھر اُدھر چاندی کے اُگالدان، آگرے کے سنگِ ترا اہل سو کا بنایا ہوا تاج محل، ایک ایسی نہایت خوبصورت زریں و مخملی کرسی جس پر بیٹھتے ہی باجہ بجنے لگتا ....."

حیدر آباد دکن نواب معین الدولہ امیر پائیگاہ تھے جن کی سالانہ جاگیر تیس لاکھ سے کیا کم ہوگی۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی جاگیر کی آمدنی دس بارہ لاکھ سالانہ تھی اور نواب خان خاناں بہادر چار لاکھ سالانہ جاگیر کے مالک تھے اور یہ سب پشتینی اُمراء تھے، ان کے یہاں بھی راقم الحروف نے چاندی کے اُگالدان نہیں دیکھے، ضلع بلند شہر اور ضلع علی گڑھ کے لال خانی اور شیروانی رئیسوں اور نوابوں کی حویلیوں، قلعوں، گڑھیوں اور کوٹھیوں میں بھی چاندی کے اگالدان نہیں تھے۔

"میرے فارسی کے معلم تھے مولوی نیاز علی خاں، اردو کے معلم تھے مولانا طاہر عربی کے معلم تھے، مولوی قدرت اللہ بیگ اور انگریزی کے معلم تھے ماسٹر گومتی پرشاد۔" (ص ۶۰)

بس یہیں تک —— اس قدر کسرِ نفسی ؟ جوشؔ صاحب کو لکھنا چاہیے تھا کہ منشی عنایت اللہ زریں رقم مجھے خطاطی سکھاتے تھے، علی یاور ڈرل ماسٹر ہاکی اور کرکٹ کھلانے پر مامور تھے، چھنا ڈوم نقلیں کر کے مجھے ہنساتا اور دو شہسوار گھوڑے کی سواری سکھانے پر مقرر تھے! راقم الحروف ضلع بلند شہر کے ایک گاؤں کا رہنے

والا ہے، بلند شہر اور علی گڑھ کے بڑے بڑے رئیسوں کے حالات سُنے ہیں، اُن کو قریب سے دیکھا ہے، بعض رئیسوں کے یہاں میں مہمان بھی رہا ہوں، مگر جو ٹھاٹ باٹ جوشؔ صاحب نے اپنے یہاں کے بتائے ہیں، وہ ان رئیسوں کے یہاں دیکھنے میں نہیں آئے! اچھتاری، پہاسو، دھرم پور، پنڈراول کی زمینداریاں دو دو لاکھ سالانہ کے لگ بھگ تھیں، اُن کے یہاں کسی رئیس زادے کی تعلیم کے لیے چار چار معلم مقرر نہیں تھے!

جوشؔ صاحب اپنے باپ کے ہمراہ اپنی زمینداری کے گاؤں میں پورے کر و فر کے ساتھ پہنچتے ہیں اور وہاں:

"ہمارے تھانے پہنچتے ہی، رعایا، جوق در جوق آئی، اور ہم دونوں بھائی کے پاؤں چھو چھو کر نذرانے دینے لگی، اور ہم نذر کے روپوں کو کھرّے[1] تخت پر بڑی بے پروائی کے ساتھ کھنا کھن اور چھنا چھن پھینکنے لگے۔ تھوڑی دیر میں پیاز کے قتلوں کے چمکتے سکوں کا تخت پر انبار سا لگ گیا اور پہاڑی سی بن گئی......"

گاؤں والے زمینداروں کو روپیہ دو روپیہ سے زیادہ نذر دے ہی نہیں سکتے تھے اور نہ دینے کا رواج تھا! اگر اس گاؤں میں کسانوں کے پانسو گھر تھے اور بہ فرضِ محال ہر گھر کے بڑے آدمی نے دو دو روپے نذریں پیش کیے تو ایک ہزار روپے کے انبار کو کیا "پہاڑی کہا جا سکتا ہے، مبالغہ کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے! اور وہ روپیہ کا انبار جوشؔ صاحب کے خدام نے لوٹ لیا اور

"اس ہنگامۂ رقصِ طلا کے بعد اب دوپہر کے کھانے کا وقت آگیا۔" (ص ۶۵)

جوشؔ صاحب کی رعایا نے تو چاندی کے روپے نذر کیے تھے۔ یہ "سونا" (رقصِ طلا) کہاں سے آگیا!

---

[1] مونج کی بنی ہوئی چارپائی جس پر کوئی دری یا کپڑا بچھا ہوا نہ ہو اُسے "کھرّی" کہتے ہیں۔ (م۔ق)

"میرے باپ نے انہیں تسلی دے کر گرگٹ تیسے کو حکم دیا کہ ماتا دین پٹواری کو بلا لاؤ، پٹواری آگیا تو انہوں نے فرمایا ماتا دین سیاہ ہے میں اس مراد کے لگان کی پوری بیباقی درج کر لو، اسی وقت رسید اس کے حوالے کر دو۔" (ص ۱۹)

حالانکہ پٹواری زمیندار کو دیئے جانے والے لگان کی رسید دینے کا مجاز ہی نہیں ہے! یہ کام تو زمیندار یا اس کے کارندے کا ہے! پھر حیرت ہے کہ جوش صاحب کے والد نے اتنے لاؤ لشکر کے ساتھ کوئی منشی اور کارندہ اپنے ساتھ نہیں لیا۔

جوش صاحب جب پہلی بار ملیح آباد سے لکھنؤ تشریف لے جاتے ہیں — تو:

"رات ہوتے ہی ہمارے باورچی کے پکائے ہوئے کھانوں کے ساتھ ساتھ عبداللہ کے دکان کی پوریاں، کچوریاں، احمد کی باقرخانیاں، سعادت کی شیرمالیں، شبراتی کے اٹھارہ اٹھارہ پرتوں کے پراٹھے، جھمن رکاب دار کے بھنے ہوئے مرغ، شاہد کا بٹیروں کا پلاؤ، حیدر حسن خاں کے پھاٹک کی گلی کا اناناس کا مزعفر، غلام حسین خاں کے پل کے کباب، کپتان کے کنوئیں کی پستے بادام کی مٹھائی اور حسین آباد کی بالائی اور نہ جانے کیا کیا نعمتیں ہمارے دسترخوان پر چن دی گئیں۔"

(صفحہ ۱۰۲)

لکھنؤ کی دکانوں کے جو کھانے انہیں یاد آتے گئے ہیں یا لوگوں کی زبانی جن حلوائیوں اور باورچیوں کے نام سُنے ہیں وہ تقریباً سب کے سب جوش صاحب نے نقل فرما دیئے ہیں! ایک وقت میں اتنی بہت سی دکانوں سے کھانے منگانے کا اہتمام افسانہ نویسی اور داستاں گوئی نہیں تو اور کیا ہے!

اسی صفحہ پر انہوں نے " دھانس بھری موٹی موٹی ہوا " بھی لکھا ہے، " بھاری ہوا " لکھنا چاہیے تھا، ہوا کو پتلی اور موٹی کون بولتا اور لکھتا ہے! حیرت اس پر ہے کہ جوش صاحب صرف شاعر ہی نہیں ہیں حیدرآباد دکن

کے دارالترجمہ میں "ناظرِ ادب" اور ترقی اردو بورڈ میں شعبۂ لغت کے نگراں اور مدیرِ اعلیٰ بھی رہ چکے ہیں!

"اُسی اثنا میں جب لفٹیننٹ گورنر سے ملنے کے لیے میاں لکھنؤ جانے لگے، میں بھی ساتھ ہو لیا" (ص ۱۲۲)

انگریزی دَور میں گورنروں سے تعلقداروں اور زمینداروں کے ملاقات کی یہ نوعیت ہرگز نہیں تھی کہ وہ اجازت کے بغیر کسی اپنے عزیز یا رشتہ دار کو ساتھ لے جائیں! پہلے ملنے کا وقت مقرر ہوتا تھا اور ملاقات کے تمام ضابطوں کی سختی کے ساتھ پابندی ضروری تھی۔

جوشؔ صاحب علی گڑھ میں چھٹی ساتویں کلاس میں پڑھتے تھے، اس وقت انہوں نے کورس کی کتابوں کی غلط سلط لمبی چوڑی فہرست اپنے والد کو بھیجی ان کتابوں کی قیمت پانسو روپے ہوتی تھی، (ص ۱۵۱) ۱۹۱۲ء میں چھٹی یا ساتویں کلاس کے کورس کی کتابوں کی قیمت بہت سے بہت بیس پچیس روپے سے زائد نہیں ہو سکتی تھی، اس فہرست میں کتابوں کی تعداد اور رقم کو بڑھا کر زائد سے زائد پانچ گنا یعنی سوا سو روپیہ کیا جا سکتا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۲۲ء میں میٹرک کے کورس کی تمام کتابیں سات آٹھ کاپیوں کے ساتھ چالیس بیتالیس روپیہ میں آئی تھیں۔ ۱۹۱۲ء میں تو چیزوں کے دام اور سستے تھے۔

جوشؔ صاحب افسانہ طراز ہی نہیں "گپ ساز" بھی ہیں! ——

"یو۔پی کے گورنر سر ہارکورٹ بٹلر میرے باپ کے بڑے دوست تھے، انہوں نے ان کے انتقال کی خبر سُنی تو تار بھیج کر مجھ کو نینی تال بلا بھیجا، اور تعزیت کے بعد مجھ سے کہا، میں آپ کو بی۔اے سے مستثنیٰ کر کے سرکاری ملازمت دینا چاہتا ہوں، آپ ڈپٹی کلکٹر بنیں گے یا اسپیشل مینیجر کورٹ آف وارڈز! میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔۔۔۔ (صفحہ ۱۴۶)

اوّل تو یہی بات تحقیق طلب ہے کہ جوشؔ صاحب کے والد (جناب بشیر احمد خاں صاحب)

سے ہز اکسیلنسی بٹلر گورنر یو۔پی کی گہری دوستی تھی؟ انگریز کے اس دورِ عروج میں کسی قصبے کے معمولی یا اوسط درجہ کے تعلقدار اور زمیندار سے انگریز ڈپٹی کمشنر کے تعلقات و روابط بھی بہت بڑی چیز تھے! ہاں! مہاراجہ سر علی محمد خاں والی محمود آباد کی بٹلر صاحب سے دوستی کی عام شہرت تھی، مہاراجہ محمود آباد نے اپنی شاندار کوٹھی کا نام ہی " بٹلر پیلس" رکھا تھا ——— پھر گورنر یو۔پی کا جوش صاحب سے یہ کہنا کہ میں تمہیں بی۔اے کی قید سے مستثنیٰ کر کے ڈپٹی کلکٹر یا اسپیشل مینجر کورٹ آف وارڈز بنانا چاہتا ہوں! ایک مضحکہ خیز لطیفہ ہے! جوش صاحب میٹرک پاس ہوتے تو بی۔اے کی قید سے مستثنیٰ ہونے کا سوال پیدا ہو سکتا تھا! انگریزی دور کے گورنر سے اس بے ضابطگی، بے اصولی اور غلط بخشی کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ساتویں آٹھویں جماعت تک پڑھے ہوئے شخص کو تمام تعلیمی شرائط سے مستثنیٰ کر کے ایک دم ڈپٹی کلکٹر بنا دے!

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ گورنر سے انہوں نے کہا:

" جنابِ والا! آپ میرے بزرگ ہیں، میں آپ کی پیشکش کو سر آنکھوں سے قبول کرتا ہوں مگر آپ کی حکومت غاصبانہ ہے، اس لیے میں آپ کی حکومت کو اصولاً غلط سمجھتا ہوں ...... "

جس زمانہ کی یہ بات ہے کانگریس اور خلافت کمیٹی کا کوئی بڑے سے بڑا لیڈر بھی صوبہ کے گورنر سے کیا دو بدو اس قسم کی گفتگو کر سکتا تھا؟

اپنے دادا کے بارے میں جوش صاحب نے لکھا ہے:

" لفٹیننٹ گورنر نے اُن کی تعلقہ داری کی سند کے ساتھ درجہ اوّل کا آنریری مجسٹریٹ بھی بنا دیا، اور وہ مہینے میں ایک بار مجسٹریٹی کے فرائض انجام دینے لگے۔" (صفحہ ۲۵۵)

اپنے دادا صاحب کے بارے میں جناب جوش صاحب نے ایک حرف بھی طنز کا نہیں لکھا کہ انہوں نے انگریز کی غاصب حکومت سے تعلقہ داری کی سند اور آنریری مجسٹریٹی

کیوں قبول فرمالی! پھر یہ بات بھی غلط ہے کہ اُن کے دادا مہینے میں صرف ایک بار آنریری مجسٹریٹی کے فرائض انجام دیا کرتے تھے! راقم الحروف کے وطن سے متّصل پون میل کے فاصلہ پر ایک مسلمان زمیندار تھے جو اسپیشل آنریری مجسٹریٹ تھے، اُن کے یہاں مقدمات کی کئی کئی دن پیشیاں ہوا کرتی تھیں! ایک دن میں تو فوجداری کے مقدمہ میں چند گواہوں کی گواہیاں بھی نہیں لی جا سکتیں، ساتھ ہی ان پر جرح ہوتی ہے اور طرفین کے وکلاء بحث کرتے ہیں!

"ایک کارندے صاحب نے جن کی تنخواہ فقط بیس روپے ماہوار تھی ساڑھے تین لاکھ روپے جمع کر لیے۔" (صفحہ ۳۵۲)

یہ تقریباً اسّی سال پہلے کی بات ہے اس وقت کے تین لاکھ روپے آج کے ایک کروڑ کے برابر ہیں۔ پندرہ بیس ہزار روپے کہتے تو بات کھپ جاتی! تین چار لاکھ نقد روپیہ خود جوشؔ صاحب کے دادا صاحب کے یہاں بھی نہیں ہوگا! ہاں! اتنی رقم بلرام پور اور دربھنگہ کی ریاستوں کے مینیجر شاید جمع کر سکتے تھے!

اپنے والدِ بزرگوار کے جمال و جلال کی تصویر جوشؔ صاحب کے خامۂ افسانہ رقم نے یوں کھینچی ہے:——

"ان میں جمال و جلال کا ایسا امتزاج تھا کہ جس جگہ بیٹھ جاتے تھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والوں کے ہجوم سے گلیاں بند ہو جاتیں۔"

یہ وہ مبالغہ ہے جو دروغ بافی کی سرحدوں کو پھلانگ جاتا ہے۔

"ان کی سرکار سے سینکڑوں بیواؤں، یتیموں اور بوڑھوں کو ماہانہ وظیفہ ملا....."

سینکڑوں حاجت مندوں کو ماہانہ وظیفہ اودھ کا کوئی بڑے سے بڑا تعلقدار بھی نہیں دے سکتا تھا، جوشؔ صاحب کے والد اور دادا تو معمولی زمیندار تھے! ہاں رام پور اور بھوپال کی ریاستوں کی نسبت سے یہ بات کہی جاتی تو درست ہو سکتی تھی!—— جوشؔ صاحب کے والدِ ماجد کے یہاں سے ہو سکتا ہے دو چار یا

دس پانچ آدمیوں کو چار چار یا پانچ پانچ روپیہ یا ایک دو کو بہت سے بہت دس روپے ماہانہ وظیفہ ملتا ہو، جسے جوشؔ صاحب نے "سینکڑوں" بنا دیا۔

"میرے چچا اس قدر مغلوب الغضب تھے کہ ذرا ذرا سی بات پر ماماؤں اصیلوں کو اس قدر زور سے ڈانٹتے اور ڈپٹتے کہ ان کی دھمک سے زمین کانپنے لگتی اور نم خوردہ چھجے کے پلاسٹر کے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کے چبوترے پر بکھر جاتے۔" (صفحہ ۳۶۸)

اس قسم کے سفید جھوٹ وہی بول سکتا ہے، جسے اس کی مطلق پروانہ ہو کہ میری اس قسم کی بے تکی باتوں کو سُن کر لوگ کیا کہیں گے؟

اپنی والدہ ماجدہ کے بارے میں لکھا ہے: ———

"اُن کی خاص مغلانیاں ممو بیگم اور عباسی خانم اُن سے مہینہ میں دو دو اور کبھی کبھی تین تین بار تنخواہیں وصول کر لیتیں اور اُن کو پتہ نہیں چلتا تھا۔"

جوشؔ صاحب نے "یادوں کی برات" کیا تصنیف کی ہے، مبالغوں کا ایک دفتر کھول دیا ہے! اپنی ذات، اپنے خاندان اور دوستوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں لکھی ہیں کہ جنہیں پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور ہوش و حواس غرقِ حیرت ہو جاتے ہیں۔

جوشؔ صاحب کے والدِ بزرگوار نے: ———

"ابرار اور اُن کے طفیل ہم دونوں بھائیوں کو (جڑاول کے لیے) ایک ایک ہزار روپے مرحمت فرما دیے تھے۔" (صفحہ ۴۰۵-۴۰۶)

اُس زمانے میں والیانِ ریاست کے شہزادوں کی قیمتی سے قیمتی جڑاول بہت سے بہت ڈیڑھ دو سو روپیہ میں تیار ہوتی تھی!

اپنے چچا زاد بھائی (نواب زادہ مصطفےٰ علی خاں) کے بارے میں لکھتے ہیں:

"......انہوں نے سینکڑوں طوائفوں پر یکے بعد دیگرے مرنا شروع کر دیا۔" (صفحہ ۶۱۶)

اس مبالغہ کے بعد فرماتے ہیں :۔۔۔۔۔۔

" چاندی سونے کے برتن بیچ بیچ کر انہوں نے اپنا تینوں بچوں کا پیٹ پالا۔" (صفحہ ۶۱)

بڑے بڑے تعلقداروں، جاگیرداروں اور رئیسوں کے یہاں نقرئی ظروف میں، پاندان، اگردان، گلوریاں رکھنے کی ڈبیہ، عطردان، گلاس اور تھالیوں کا ہونا تو قرینِ قیاس ہے۔ مگر " سونے کے برتن " یہ جوش صاحب نے گپ لگائی ہے۔
اور سنیئے :۔۔۔۔۔۔

" وہ جب اپنی زمین کا کوئی ٹکڑا فروخت کرتے اور روپیہ ان کی جیب میں آتا تو دس منٹ ضائع کیے بغیر وہ ریل، ٹیکسی، بس، تانگے یا اکّے میں بیٹھ کر گولڈن نائٹ منانے کے واسطے لکھنؤ چلے جایا کرتے۔"

۔۔۔۔۔۔ (صفحہ ۶۶)

علی گڑھ جہاں مسلم یونیورسٹی تھی دو انٹرمیڈیٹ کالج اور کئی ہائی اسکول تھے، ضلع کا صدر مقام اور محکمہ زراعت اور محکمہ نہر کے دفاتر تھے، بہت بڑا گورنمنٹ پرنٹنگ پریس تھا، ریلوے جنکشن تھا، زمینداروں کی کوٹھیاں تھیں، شہر کی آبادی ستر ہزار کے قریب تھی، بیسیوں گزٹیڈ افسروں یا ان کے درجہ اور تنخواہ کے عہدیداروں کا مستقر تھا، اس شہر میں تقریباً ۱۹۴۰ء تک ایک بھی ٹیکسی نہ تھی مگر قصبہ ملیح آباد میں اب سے پچاس سال قبل موٹر ٹیکسیاں چلتی تھیں! اس بے سلیقگی کے ساتھ جھوٹ کم ہی بولا گیا ہوگا

جوش صاحب نے یہ تک لکھ دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے دو بار خواب میں دیکھا تھا، اور حضور ؐ نے ان سے ارشاد فرمایا تھا :۔۔۔۔۔

" یہ نظامِ دکن ہے، تم کو دس برس اس کے زیرِ سایہ رہنا ہے۔"

۔۔۔۔۔۔ (صفحہ ۲۱۷)

اس کے بعد اُن کے کپڑوں سے خوشبو کی لپٹیں نکل رہی تھیں، ان کی بیگم صاحبہ حیران

تھیں کہ یہ کیا ماجرا ہے، گھر کے دوسرے لوگ بھی اس خوشبو کو سونگھ رہے تھے!
اس موقعہ پر ناطقہ سر بگریباں اور خامہ انگشت بدنداں ہے!

ریاست دتیا کے وزیر اعظم قاضی سر عزیز الدین سے ایک واقعہ منسوب کیا ہے کہ انہوں نے ہفتہ وار اخبار نکالنے کی پیش کش کی، اور جوش صاحب سے کہا:-

"سردست ریاست آپ کو سولہ سو روپیہ ماہانہ دے گی اور سال آئندہ کے بجٹ سے یہ رقم دگنی کر دی جائے گی۔" (صفحہ ۲۵۲)

دتیا اسٹیٹ کے وزیر اعظم قاضی کمر عزیز الدین کی تنخواہ بہت سے بہت تین ہزار ہوگی! اور اس سے زیادہ تنخواہ وہ جوش کو دینے کے لیے اصرار کر رہے تھے!
میر جعفر زٹلی آج زندہ ہوتے تو جوش صاحب کے آگے کان ٹیک کر "استاد زندہ باد" کے نعرے لگاتے!

"میری بات کاٹ کر انہوں نے کہا آپ اپنے دوست جواہر لال کے بہکانے میں آگئے ہیں۔" (صفحہ ۲۵۲)

حیدر آباد دکن سے جب جوش صاحب کا اخراج ہوا ہے (غالباً ۱۹۳۴ء میں) یہ اس زمانے کا ذکر ہے مگر اس وقت تک جواہر لال نہرو سے اُن کی شناسائی کہاں ہوئی تھی! پنڈت نہرو سے تو مسز سروجنی نائیڈو نے ان کا تعارف کرایا تھا، اور یہ غالباً تقسیم ہند سے کچھ پہلے یا بعد کی بات ہے۔

"اس واقعے کے کوئی دو برس کے بعد ایک روز نواب مہدی یار جنگ بہت گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے اور کہا بڑا غضب ہو گیا، ہوش بلگرامی نے سرکارِ عالی تک یہ خبر پہنچا دی ہے کہ آپ کے..... شہزادی سے بڑے گہرے مراسم ہیں اور یہ بھی انہوں نے کہا ہے.... محل میں جس وقت...... شاہ زادی جوش کو روک رہی تھیں......."

(صفحہ ۲۴۳)

نواب مہدی یار جنگ بہادر قلمروِ آصفیہ کے صدر المہام (منسٹر) تھے وہ جوش صاحب

کو اپنے یہاں بلا سکتے تھے، اُن کا جوشؔ صاحب کے مکان پر جانا نری افسانہ نگاری ہے۔ حیدرآباد دکن میں جوشؔ صاحب کے یہاں صدر المہام اور معتمد (سیکرٹری) کے درجہ ( ) کے اعلیٰ عہدے دار نہیں جایا کرتے تھے! اور شہزادی سے جوشؔ کے مراسم و تعلق کا ذکر بھی جوشؔ صاحب کا طبعزاد لطیفہ ہے!

"اور اس اُفتادِ مزاج کے ساتھ میں جس وقت نظام کے روبرو سراپا انکسار بن کر جاتا ان کو "سرکار" کہتا اور اُن کی زبان سے اپنے متعلق تخصص "تم" سنتا تھا تو میرے دل پر ایسی کاری ضرب لگتی تھی کہ بلبلا اٹھتا......" (صفحہ ۲۴۲)

سالگرہ مبارک اور عیدین کے موقعہ پر دوسرے سینکڑوں گزیٹڈ عہدیداروں کے ساتھ جوشؔ صاحب بھی نذر گزراننے کے لیے نظامِ دکن کے حضور باریاب ہوتے تھے! میر عثمان علی خاں نظامِ دکن کے دربار میں جوشؔ صاحب کا آنا جانا نہیں تھا! اور یہ بات بھی غلط ہے کہ نظامِ دکن جوشؔ صاحب کو "تم" سے خطاب کرتے تھے، نواب عثمان علی خاں مرحوم، کوتوالِ شہر نواب شہید یار جنگ، نواب ہوش یار جنگ اور بعض دوسرے مصاحبوں، بڑے عہدیداروں اور جاگیرداروں کو "تو" کہتے تھے! نواب سالار جنگ بہادر کے یہاں مجلسِ عزا میں البتہ راقم الحروف نے مہاراجہ کشن پرشاد کو نظامِ دکن کی زبان سے "تم" سے خطاب کرتے ہوئے سُنا ہے!

"کاتبوں، کاغذ والوں، بلاک سازوں اور چھاپہ خانہ والوں نے بھی یہ سمجھ کر کہ میں لُر آدمی ہوں مجھے دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابھی دوسرا پرچہ (کلیم) شائع نہیں ہوا تھا کہ تمام روپیہ تر بھر ہو گیا۔" (صفحہ ۲۵۸)

بے چارے کاتب، کاغذ والے، بلاک ساز اور چھاپہ خانہ والے کسی اخبار کے مالک اور ایڈیٹر کو لوٹا نہیں کرتے، کاغذ کا عام نرخ سب کو معلوم ہوتا ہے،

اور کاتبوں، بلاک سازوں اور چھاپہ خانہ والوں کی اجرت کا بھی پتا ہوتا ہے، لوٹنے اور لُٹ جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، روپیہ پیسہ کے معاملے میں جوشؔ صاحب بقولِ خود کتنے کُرے ہیں، اس کا حال آگے آ رہا ہے۔

"میں قوی حافظہ کا مالک کبھی نہیں رہا، اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ رات کو کیا چیز کھائی تھی، صبح کو یہ بھی یاد نہیں رہتا —— کئی مہینہ کی بات ہے تاروں کی چھاؤں میں، ٹہلنے کے لیے نکلا تھا، واپسی میں اپنے گھر کا راستا بھول گیا —— ایک روز دستخط کی نوبت آئی تو اپنا تخلص بھول گیا۔" (ص ۲۵)

اپنی شخصیت کے بارے میں اعجوبگی اور انوکھا پن Peculiarity پیدا کرنے کے لیے جوشؔ صاحب نے یہ باتیں کہی ہیں —— میرے شیر نے شاید اس کی قسم کھا رکھی ہے کہ جو بات بھی لکھوں گا، اس میں اصلیت اگر ہوگی تو بہ قدرِ نمک ہوگی —— باقی مبالغہ، نمک مرچ اور افسانہ طرازی اور دروغ بافی۔

جوشؔ صاحب نے اپنے کو "لکھ لٹ" اور اپنی بیگم صاحبہ کو کُرزس اور محتاط لکھا ہے —— اور ایک دن اُن کی بیوی نے کہا: ——

"اسی دن کے لیے میں تم سے کہا کرتی تھی کہ روز دعوتیں نہ کرو، غول کے غول آدمیوں کو روز شرابیں نہ پلاؤ، اتنے اللے تللے نہ کرد۔" (ص ۲۴۶)

جوشؔ صاحب کے بیسیوں احباب اور شناسا کراچی میں موجود ہیں جو حیدرآباد (دکن) سے جوشؔ صاحب کو جانتے ہیں۔ حیدرآباد میں، پونا میں، دلی اور کراچی میں، غرض جہاں بھی وہ رہے اُن کی سخاوت اور مہمان نوازی کی شہرت نہیں سُنی گئی! ۱۹۳۶ء میں جب حضرت سائلؔ دہلوی کا دلی میں مہمان تھا تو ایک دن جوشؔ صاحب کے یہاں ردیہر کا کھانا کھایا، سادہ قسم کی تین چیزیں تھیں اور میرے علاوہ فرید آباد کے ایک صاحب شریکِ طعام تھے! ان صاحب کی عجیب

لہ۔ مجھے یاد آیا حکیم آزاد انصاری ان دنوں جوشؔ صاحب کے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وضع قطع تھی۔ سفید کوٹ اور سر پر کئی گز کا سفید عمامہ، چہرہ خاصہ مکروہ! اعتقاد کے لحاظ سے دہریے! مجھ سے بہت دیر تک مذہبی بحث رہی، جوشؔ صاحب اس "ناستک" کے ہم نوا تھے۔

جوشؔ صاحب کی سخاوت اور ان کے "لکھ لُٹ" ہونے کا حال تو اُن لوگوں سے پوچھیے جن کے مکانوں میں وہ کرایہ سے رہے ہیں! جب وہ نیوٹاؤن کے فلیٹ میں رہتے تھے تو راقم الحروف کا وہاں جانے کا اتفاق ہُوا، زینہ کتنا گندہ تھا اور ناشستہ پیالی میں چائے جو آئی تو اُسے پیتے میں ایسا لگا جیسے چائے کی پتّی کے ساتھ اجوائن بھی اوٹا دی گئی ہے ——! جوشؔ صاحب کرایہ کے اس فلیٹ سے اٹھ کر جب اپنے نو تعمیر مکان میں منتقل ہو گئے تو مالک مکان نے جو فلیٹ کی زیریں منزل میں رہتے تھے مجھ سے کہا کہ ایک بڑے عذاب سے مجھے نجات مل گئی! جوشؔ صاحب کے بعض ایسے دوست بھی ہیں جنہوں نے جوشؔ صاحب کی خاطر و مدارات اور تواضع پر ہزاروں روپے خرچ کیے ہیں مگر جوشؔ صاحب کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ انہیں اپنی کوئی کتاب ہی عنایت فرما دیتے! پھر وہ خودستائی اور مبالغہ سے بچنے کے لیے خود کو "لکھ لٹ" لکھنے کی بجائے "کشادہ دست" بھی کہہ سکتے ہیں۔

جوشؔ صاحب نے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا جس انداز میں ذکر کیا ہے وہ اُن کی طبیعتِ شوخ کی نری اُپج ہے! یا یوں سمجھیے کہ حافظہ کا سہو اور یادداشت کی بھول ہے!

جوشؔ صاحب نے صفحہ ۲۲۴ اور ۲۲۵ پر نظامِ دکن کے پانچ روپے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

یہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور انہوں نے بھی ساتھ مل کر کھانا کھایا۔

اپنی بیگم صاحبہ کے دوالانے کے واقعہ کا ذکر کیا ہے اور اس ضمن میں جو تفصیل بیان کی ہے وہ بھی اُن کے دماغ کی " از من جملہ مصنوعات " ہے!

جناب جوشؔ نے اپنے ماموں نواب رستم علی خاں مہرؔ کے بارے میں لکھا ہے:

" لیکن علم کی اس جامعیت اور تقشف کی اس شدت کے باوجود اُن کو بے حد شوق تھا دروغ گفتاری کا! آغازِ تاریخ سے لے کر اس عالم کون و فساد میں جس قدر بھی دروغ گو انسان ہو چکے ہیں وہ اُن سب سے قطعی طور پر مختلف تھے، ان کی دروغ گوئی کسی مادی فائدے کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ مقصود بالذات تھی ...... وہ ہر سال بجٹ بناتے اور اس میں مبلغ شش ہزار سالانہ "برائے پرورش کذب"[1] کی بھی ایک مد ہوا کرتی تھی۔" (ص۶۲۳)

جوشؔ صاحب کو یہ وصفِ خاص جس کا ذکر انہوں نے بڑے مزے لے لے کر کیا ہے، اپنے ماموں سے ورثہ میں ملا، اس طرح " یادوں کی برات " کا نواب رستم علی خاں (اعلی اللہ مقامہ) کی روح کو پہنچا کرے گا ___ کہ دروغ گو ماموں کے افسانہ ساز بھلنجے نے ماموں کی اس سنت کو برقرار رکھا۔ بلکہ کہیں کہیں تو اس " صنعت " میں ایسی ایسی جدتیں کی ہیں کہ ان کے ماموں جان کو بھی نہ سوجھی ہوں گی۔[2]

جھوٹ بولنے والوں کی پرورش کے لیے چھ ہزار روپے سالانہ کی رقم اپنے بجٹ میں شامل کرنا ___ یہ بھی دنیا کے جمع و خرچ کے گوشواروں ___ اور میزانیوں (BUDGETS) میں سب سے انوکھی اور نرالی مد (ITEM) ہے!

جوشؔ صاحب نے اپنے نانا (نواب خواجہ محمد جاگیردار دھول پور) اور اپنے ماموں (رستم علی خاں مہرؔ) کا ذکر خاصی تفصیل سے کیا ہے اور جس زمانے میں اُن کا

---

[1] " اشاعت یا فروغ " لکھنا تھا

[2] جوشؔ صاحب نے اپنے ماموں کی دروغ گوئی کا جس مبالغہ کے ساتھ ذکر کیا ہے، وہ خود اپنی جگہ جھوٹ کا پربت ہے۔

دھول پور میں قیام تھا، اُس کا حال بھی لکھا ہے مگر مہاراجہ نہال سنگھ والیٔ دھولپور کے راج محل میں جو گجرا بائی داخل تھی اُس کا ذکر نہیں فرمایا جوشؔ صاحب کے نزدیک دینی اخلاق کے حدود، ضابطوں اور شرعی رشتوں کی کوئی حیثیت اور وقعت ہی نہیں ہے تو پھر نانہالی قرابت داری کے ذکر و بیان سے گریز کیوں ؟ —— نواب رستم علی خاں لاولد تھے، اُن کے انتقال کے بعد جوشؔ صاحب نے اُن کی جاگیر اپنے نام منتقل کیے جانے کی جان توڑ کوشش کی۔ مہاراجہ دھولپور کے نام کانگریسی لیڈروں کے سفارشی خطوط بھی حاصل کیے مگر کامیابی نہیں ہوئی اس کا ذکر انھوں نے نہیں کیا۔

اب جناب جوشؔ اور ان کے خاندان والوں کے غیظ و غضب اور بے رحمی کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے :

○ میرے غیظ و غضب کا یہ عالم تھا کہ ساتھ کھیلنے والے بچوں سے اگر کسی بات پر بگڑ جاتا تو بید مار مار کر اُن بے چاروں کی کھال کھینچ لیا کرتا تھا۔ (ص ۴۵)

○ اپنی چھوٹی بہن انیس جہاں سے تو میرے ایسے ہنگامے ہوا کرتے تھے کہ اللہ کی پناہ! وہ بھی بچپن میں میری ہی طرح اس قدر بد مزاج، زود غضب اور چڑچڑی تھی کہ ہنگامِ جنگ میرا گریبان پکڑ کر چاک کر دیتی اور میں اُس کے جھونٹے[۱] نوچ کر پھینک دیتا۔ (ص ۴۵)

○ ..... مجھے اس قدر غصہ آگیا تھا کہ میں نے باپ کی طرف چاقو[۲] اس طرح نشانہ باندھ کر پھینک مارا تھا کہ اگر وہ ان کے سینے میں چبھ جاتا تو لہولہان ہو جاتے۔ (ص ۴۶)

○ ایک روز میں اپنے پھاٹک پر بڑی سی ہوائی بندوق بھرے کھڑا تھا ایک مالی کا لڑکا میرے سامنے سے گزرا، لیکن مجھے سلام نہیں کیا، اس کی گستاخی پر مجھے تاؤ آگیا، میں نے اُس پر دَن سے فائر کر دیا، بڑا سا چھرا اس بیچارے

---

۱ سر کے بال ۲ چاقو

کے پیٹ میں پیوست ہوگیا اور وہ تڑپنے لگا، اور محمد شفقی نے اس کے تڑپنے پر رحم کھانے کے عوض اس کی پسلی پر زور سے ٹھوکر مار کر کہا ابے! دو کوڑی کے نائی اٹھ اور سلام کر، اور جب وہ غریب کراہتا اٹھا اور جھک کر مجھے سلام کیا تو میرا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔" (ص۴۸)

○ "وہ میرے پنپیا نے اس (کسان) کے منہ پر تھپیڑ اس زناٹے سے مارا کہ وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا اور اس کی مرجھائی بیوی کی آنکھوں سے ڈھل ڈھل آنسو بہنے لگے۔" (ص۶۶)

○ "میں نے اپنے غلام زادے حسین بخش کے ننگے سر پر وہ کرچ کھینچ مار دی تھی اور اس بیچارے کے سر سے ڈھل ڈھل خون بہنے لگا تھا" (ص۶۵)

○ "انہوں (جوش صاحب کے والد بزرگوار) نے بھرے ہوئے حقہ کی دہکتی چلم کے انگارے ہمارے ہاتھ پر گرا دیئے، ہمارے ہات[1] بری طرح جل گئے اور صبح تک بڑے بڑے آبلے پڑ گئے۔" (ص۲۶۳)

صائمہ بیگم جوش صاحب کے پردادا نواب فقیر محمد خاں گویا کی چہیتی بیٹی تھیں، اُن کی شقاوت کا یہ عالم تھا۔

○ "...... فوراً حکم دیا کہ اس کلموئی ٹھنیا کو زندہ دفن کر دیا جائے اور اس بے چاری لونڈی کو محل کے ایک گوشے میں قدآدم گڑھا کھود کر دفن کر دیا گیا۔" (ص۳۷۸)

○ "یہ ہے میری بیوی کے مزاج کا پس منظر، وہ بہ ہمہ وجوہ صائمہ بیگم ہیں اس لیے جب اُن کو غصہ آجاتا ہے تو جان لینے اور جان دینے پر اُتر آتی ہیں۔" (ص۳۷۹)

جوش ملیح آبادی نے خود اپنی اور اپنے بعض رشتہ داروں کی بے رحمی، شقاوت ظلم و سنگدلی اور مردم آزاری کے جو واقعات لکھے ہیں، اُن سے اندازہ کیا جا سکتا

---

[1] ہاتھ

ہے کہ شاعرِ انقلاب نے کس ماحول اور کس گھرانے میں پرورش پائی تھی اور بچپن ہی سے اُن کی فطرت کتنی سنگین کس قدر اذیت دہ اور کٹھور ہو گئی تھی! ؎

جس کی بہار یہ ہو پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ

جوشؔ صاحب کی بچپن کی شرارت کا ایک نمونہ: ـــــــ

"ایک بار مجھے اور محسن کو یہ شرارت سوجھی کہ چھت کے روشن دان سے مظہر علیم صاحب کے منہ پر پیشاب کیا جائے۔ چنانچہ رات کے بارہ بجے ہم دونوں چھت پر چڑھ گئے، اُن کے کمرے میں لمپ جل رہا تھا۔ ہم نے جب دیکھا کہ عین روشن دان کے نیچے ان کی چارپائی بچھی ہوئی ہے تو ہم دونوں نے بڑے خضوع وخشوع کے ساتھ اپنے اپنے پائے جامے کھولے اور نشانہ باندھ کر شر شر اُن کے منہ پر دھاریں مارنے لگے، سوتے میں ان کے منہ پر جب گرما گرم پیشاب کی دھاریں پڑنے لگیں تو وہ چیخ مار کر اٹھ کھڑے ہوئے۔" (صـ۱۵۳)

جس بچّہ کے بچپن میں ایسے لچھن ہوں، وہ بڑا ہو کر جو بھی کر گزرے تھوڑا ہے! بے حیائی اور مردم آزاری شاعرِ انقلاب کی گھٹی میں پڑی تھی! اس عبارت میں "خضوع وخشوع" نے "مزاح" پیدا کر دیا مگر لکھنے والے کی دنائتِ طبع کو بھی ظاہر کر دیا۔

جوشؔ صاحب نے اپنے والدِ محترم کے ساتھ پہلی بار جب لکھنؤ کا سفر کیا ہے تو وہ "بانس والی سرائے" میں جا کر ٹھہرے۔ (صـ۱۵۲) ہوٹلوں میں کس لیے قیام نہیں فرمایا اس کی توجیہہ انھوں نے یوں کی ہے: ـــــــ

"اس وقت لکھنؤ میں برلنگٹن اور امپیریل ہوٹل کے سوا اور کوئی ہوٹل تھا ہی نہیں اور چونکہ وہ دونوں ہوٹل بدنام تھے کہ وہاں شراب پی جاتی اور سؤر کی چربی کا کھانا کھایا جاتا ہے۔ اس بنا پر قرب وجوار کے تمام شرفاء کی طرح میرے باپ بھی ان ہوٹلوں کی

طرف کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے"۔ (صفحہ ۱۵۲)

مگر جوش صاحب کے والدِ بزرگوار جن کے ٹھاٹ باٹ والیان ملک جیسے تھے، ہوٹل میں ٹھیر کر اپنے کھانے پینے کا الگ سے انتظام فرما سکتے تھے! پھر ان کی لیفٹننٹ گورنر یعنی صوبہ کے سب سے بڑے حاکم سے دوستی تھی تو وہ سرکاری ڈاک بنگلہ، ریسٹ ہاؤس یا سرکٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کی اجازت لے سکتے تھے! اور سب سے زیادہ آسان، عزت و وقار اور سہولت و آرام کی بات یہ تھی کہ ایک مہینہ کا پیشگی کرایہ دے کر کوئی کوٹھی بنگلہ یا بڑا مکان کرایہ پر لے لیتے!" بانس کی سرائے" میں قیام کا حال لکھ کر جوش صاحب نے اپنے نوابی کارخانے کی روایتوں کو بہت کچھ مشتبہ اور مجروح بنا دیا!

"اور ہمارا سامان" پاس والی سرائے" میں جانے لگا، اور اربابِ لکھنؤ ہمارے افغانی خط و خال، ہمارے قد و قامت اور ہمارے سپاہیوں کی سج دھج اُن کے بڑے بڑے پگڑ اور اُن کے موٹے موٹے لٹھ دیکھنے کے لیے ٹھٹ کے ٹھٹ لگا کر ہمارے گرد و پیش جمع ہو گئے"۔ (صفحہ ۱۰۰)

ملیح آباد شہر لکھنؤ سے بارہ چودہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس سفر سے پہلے جوش صاحب کے خاندان کے لوگ اور اُن کے سپاہی، پیادے اور نوکر وہاں بارہا آئے ہوں گے! لکھنؤ کے مضافات میں بہت سے تعلقدار اور رؤسا رہتے تھے، وہ بھی آدمی کے بچے تھے، اُن کے بھی سپاہی اور پیادے تھے، اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ تھے کیا اس نواح میں جوش صاحب کا خاندان ہی خط و خال، ڈیل ڈول اور قد و قامت میں عوج بن عنق کی نسل سے تعلق رکھتا تھا، اور لکھنؤ والوں نے کیا اس سے پہلے پگڑ والے لٹھ بند سپاہی اور دیہاتی پوربیئے نہیں دیکھے تھے۔

سکھوں کے جو لطیفے عام طور پر مشہور ہیں، اُن میں ایک یہ لطیفہ بھی ہے کہ ایک سکھ کسی شہر کے بازار سے گزر رہا تھا، اُس کے لبوں کے بڑھے ہوئے بال اور گھنی ڈاڑھی کو دیکھ کر ایک شخص نے از راہِ طنز و مذاق اپنے دوسرے ساتھی

سے کہا:

"سردار جی کے منہ تو ہے ہی نہیں، یہ کھانا کیسے کھاتے ہیں۔"

اس پر سردار جی نے اپنے دونوں ہونٹ چیر کر دکھائے اور بولا..... یہ کیا.....؟

اس مشہور لطیفہ کا جوڑ جوش صاحب نے اپنے یہاں کے ملازم کنجو خاں سے ملا دیا۔ (صفحہ ۵۹۲)

فانیؔ بدایونی کے حیدر آباد پہنچنے کے لیے کئی مہینہ بعد اُن کا بڑا لڑکا جس کی خاصی لمبی ڈاڑھی تھی آگرے سے حیدر آباد آیا، سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی، فانی صاحب سے ملنے کے لیے اُن کے یہاں گئے تو فانیؔ بدایونی کے باریش صاحبزادے نے بتایا کہ ابا مہاراجہ بہادر کے یہاں گئے ہیں! ہوش بلگرامی وہاں سے سیدھے مہاراجہ بہادر کی ڈیوڑھی پہنچے اور مہاراجہ کو آداب و سلام کرنے کے بعد بولے۔ سرکار! میں فانیؔ صاحب کے والدِ محترم سے مل کر آ رہا ہوں....... پھر انہوں نے فانیؔ صاحب کے نووارد لڑکے کی ڈاڑھی کا نقشہ کھینچا، مہاراجہ بہادر اور اہلِ دربار ہنسنے لگے! جوش صاحب نے یہ لطیفہ قدرے بدل کر خود اپنی ذات سے منسوب کیا ہے! اور اس میں بھی ایک بات اٹل بے جوڑ لکھ گئے!

"میں نے کہا مبارک پسر پدر نما" (صفحہ ۵۰۵)

فانیؔ بدایونی کے ڈاڑھی کب تھی جو اُن کے ڈڑھیل بیٹے کو جوش صاحب نے "پسر پدر نما" سے تشبیہ دی!

"ہمارے خاص معلم تھے واجد علی صاحب شیدا اور قاضی عبدالجلیل مراد آبادی۔" (صفحہ ۱۴۹)

صحیح نام قاضی جلال الدین ہے جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جغرافیہ پڑھاتے تھے! صفحہ ۵۰۳ پر نظام الدین حسن کو ـــــ انہوں نے "ناظم الدین حسن" لکھا ہے اور ان کو حیدر آباد ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بتایا ہے حالانکہ وہ ہائی کورٹ کے جج (جسٹس) تھے۔

گاندھی جی کی جوش صاحب نے خاصی تعریف کی ہے مگر زبانِ بازاری اور

شراب خانوں کے خلاف گاندھی جی کی تحریک پر جوشؔ صاحب نے پھبتی کسی ہے :۔

" انہوں نے جب بازارِ حسن و خرابات کے خلاف غیر عاقلانہ آواز اٹھائی
اور انسانی مسرت کا گلا گھونٹ دینے کی مجرمانہ تحریک چلائی ....
ان کی آواز زیرِ پردہ تمام گزیدگانِ اخلاق اور کرام ......" (صفحہ ۱۰۵)

عنفوانِ شباب میں جوشؔ صاحب کا جسم طوائف کی پشواز کے دامن سے چھو جاتا ہے :۔

" کانوں سے سُنا تھا کہ پشتِ رسالت پر مہرِ نبوت[1] ثبت ہوا کرتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ میری پشتِ دست پر اس پشواز کی
مہرِ لمس آج تک دمک رہی ہے۔" (صفحہ ۱۱۶)

جوشؔ صاحب کے آباؤ اجداد سُنّی حنفی تھے، انہوں نے اپنے تبدیلِ مذہب کی تفصیل لکھی ہے اور اس معاملہ میں اُن کے تشدد اور غلو کا یہ حال تھا کہ جوشؔ صاحب نے باپ کی جائداد سے محروم ہونا گوارا کر لیا مگر "تبرّے" سے دست برداری گوارا نہیں کی! (صفحہ ۱۵۹) ایک طرف وہ جواہر لال کو " انسانیت کا اعتبار " کہتے ہیں دوسری طرف اُن نفوسِ قدسیہ پر تبرّا کرتے ہیں جن کی ذات سے دنیا میں نیکی اور شرافت پہچانی جاتی ہے۔ جب آدمی کی مت ماری جاتی ہے اور اس کے دل و دماغ فہمِ صحیح اور احساسِ خیر و تقویٰ سے محروم ہو جاتے ہیں تو وہ نیک لوگوں اور برگزیدہ انسانوں کو گالیاں دینے میں فخر اور اپنے عقیدے کی بڑائی محسوس کرتا ہے :۔

" جو اب تک مجھ کو مومن سمجھ رہا ہے وہ اپنے حسنِ ظن سے دست بردار
ہو جائے اور جس کے نزدیک میں خدا کا منکر یعنی لفظ خدا کے لا محدود

---

[1] طوائف کی پشواز کے لمس کے ساتھ مہرِ نبوت کا خیال ۔ توبہ! جو مسلمان اس عبارت کو پڑھے گا شدید روحانی اذیت محسوس کرے گا! اس خبثِ باطن سے اللہ تعالیٰ کی پناہ !

معنی میں منکر ہوں وہ اپنے سوءِ ظن سے توبہ کرے .... میں کافر باللہ اور مومن بالانسان ہوں۔" (ص۲۲۳)

یہ پورا باب ——— "میرا دین" ——— جوش صاحب کے ذہن و فکر کی کجی، عقل کی ناپختگی و خامی اور شعور کی نارسیدگی اور دماغ کے الجھاؤ کی شہادت دے رہا ہے!

جوش صاحب نے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ جناب حضرت حسین رضی اللہ عنہ، کی شان میں پرجوش قصیدے لکھے ہیں۔ اس کتاب میں بھی ان نفوسِ قدسیہ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے مگر وہ عقیدے اور عمل کے اعتبار سے ان بزرگوں کی متضاد واقع ہوئے ہیں، وہ خدا شناس یہ خدا کے منکر، وہ غیرت و حیا کے مقدس پیکر، یہ بے حیائی اور فحاشی کے مبلغ، وہ صاحب تقویٰ اور انتہائی عابد و زاہد اور جوش صاحب متقیوں، زاہدوں اور صالحین پر "مخنثین" کی طنز کرنے والے اور نماز پڑھنے والوں کا مذاق اڑانے والے!

اس کتاب میں جوش صاحب نے بڑے بڑے کرتب دکھائے ہیں۔ ایک طرف اپنے باپ دادا کی امارت و دولت کو مبالغہ آرائی اور افسانہ طرازی کے مائونٹ ایورسٹ تک پہنچا دیا ہے، دوسری طرف اپنے معاشقے اور رندی و آوارگی کی داستانیں بیان کر کے اپنی مردمی شہوت پرستی اور جسم و صورت کی جنسی کشش کا اشتہار دیا ہے! مگر اس تصویر کا یہ رُخ انتہائی نازک و پُرپیچ بلکہ مغالطہ انگیز ہے اور میں تو اس کے تصور سے کانپ جاتا ہوں۔ جوش صاحب نے اس کا دعویٰ کیا ہے کہ دو بار خواب میں انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی تھی! پھر حیدرآباد کے ایک بزرگ مولوی احمد حسین[1] کی شخصیت پر ایک باب لکھ کر اُن کی زبان سے اپنے بارے میں یہ کہلوایا ہے: ———

---

[1] جوش صاحب نے گاندھی جی کو اپنی نظم میں "ہند کے شاہِ شہیداں" لکھا تھا!
؎ کفر بھی خوش رہے، اسلام بھی ناراض نہ ہو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"جب آپ اپنی عمر کے دورِ آخر میں داخل ہو جائیں گے، قدرت آپ سے ابلاغ توحید کا کام لے گی، آپ الفس و آفاق کی وحدت کا آوازہ بلند کریں گے، اور وہ وحدت الٰہی تک جائے گی اور دوسری بات یہ ہے کہ جب آپ کو کسی حدیث کی صحت میں شک ہو گا، آپ براہِ راست خود رسولؐ سے جا کر پوچھ لیں گے۔" (ص ۶۱۳)

جوش صاحب شیطان و ابوجہل کی عظمت کے قائل ہیں، انہوں نے اپنی شاعری میں خدا کا، اسلام کا اور اخلاق کا مذاق اڑایا ہے —— کیا اسی کا نام "ابلاغ توحید" اور "وحدتِ الٰہی" ہے، ایک طرف جوش صاحب روحانیت، آخرت اور عالمِ غیب کے منکر ہیں، دوسری طرف مولوی احمد حسین کو غیب داں ٹھہراتے ہیں کہ انہوں نے جوش صاحب کی شاعری کے بارے میں جو پیشگوئی کی تھی وہ صحیح ثابت ہوئی! اور جوش صاحب مولوی احمد حسین حیدرآبادی کی پیش گوئی کے مطابق اس درجہ پر فائز ہیں کہ احادیث کی صحت و عدم صحت کے بارے میں براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

؎ ان کے بارے میں جوش صاحب نے لکھا ہے (جس کا خلاصہ یہ ہے) کہ بلدہ حیدرآباد کے خواجہ کے چلّہ میں جب قرآن پڑھا جا رہا تھا، تو نظامِ دکن، مہاراجہ کشن پرشاد سے گفتگو کرنے لگے اس پر مولوی احمد حسین نے بآوازِ بلند کہا: "اثنائے قرأت میں باتیں کرنا بدتمیزی ہے خاموش ہو جایئے اور مزید بدتمیزی مت کیجئے" نظامِ دکن نے ان کی حق گوئی کی قدر کی اور تین سو روپیہ ماہوار وظیفہ تاحیات کی پیشکش کی مگر انہوں نے وظیفہ لینے سے انکار کر دیا۔ مُلّا واحدی صاحب نے راقم الحروف سے (بہ روایت خواجہ حسن نظامی) بیان کیا ہے کہ یہ واقعہ بلدہ حیدرآباد کی مکہ مسجد کا ہے نظامِ دکن کو باتیں کرتا دیکھ کر ایک شخص نے صرف اتنا کہا تھا کہ "جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو باتیں کرنا ممنوع ہے۔" صورتِ واقعہ چاہے کچھ بھی ہو غور طلب اور لائقِ تحقیق بات یہ ہے کہ کیا یہ صاحب واقعی وہی شخص تھے جنہوں نے نظامِ دکن کو ٹوکا تھا اور جن کے جوش صاحب سے روابط تھے؟
(م۔ق)

سے دریافت کر سکتے ہیں! دروغ گوئی کی یہ صنعتِ لف ونشر! استغفراللہ!

پھر انہی مولوی احمد حسین کی زبان سے اپنی بادہ خواری کے بارے میں جوش صاحب یہ کہلواتے ہیں : ــــــــــ

"اب رہی آپ کی بادہ خواری ہو میں کہہ چکا ہوں کہ یہ آپ کا مراقبہ ہے، اپنی شراب کو آپ گناہ سمجھ رہے ہیں یہ بولنا گناہ ہے۔"

شراب جو ہر اسلامی فرقہ کے نزدیک کسی اختلاف کے بغیر "ام الخبائث" ہے اور جس کا پینا بیچنا اور تیار کرنا حرام ہے ـــــ کیا کوئی مسلمان بہ صحتِ ہوش و حواس اُس کے پینے کو "مراقبہ" کہہ سکتا ہے؟ مولوی احمد حسین نام کا شخص، جس نے جوش صاحب کو تقدیس و روحانیت کے منصب بلند پر فائز کیا ہے، یہ بھی جوش صاحب کی خود تراشیدہ شخصیت معلوم ہوتی ہے! اور شاعرِ انقلاب نے مولوی احمد حسین کی شخصیت کے پردے میں اپنے الحاد اور شراب خواری کو روحانیت و تقدیس کا لبادہ اڑھانے کی کوشش کی ہے۔

شراب نوشی جوش کا مُراقبہ ہے تو امرد پرستی اور زناکاری جس پر وہ فخر کرتے ہیں مقاماتِ کشف و اشراق ہوں گے۔ قرآنِ کریم میں اسی کردار و مزاج کے لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے : ــــــ

...... ولکن قست قلوبهم وزین لهم الشیطٰن ما کانوا یعملون

(لیکن ان کے دل سخت ہو گئے ـــــ اور جو کرتوت وہ کرتے تھے شیطان نے وہ (ان کی نگاہ میں) خوب صورت بنا دیئے)

فحاشی و بے حیائی اور فسق و فجور کی جن باتوں پر جوش صاحب فخر کرتے ہیں، وہ ہر آدمی کے لیے وجہ عار اور باعثِ ننگ و نام ہیں! جن اعمالِ بد پر ایک شریف آدمی کو نادم ہونا چاہیے، جوش صاحب کے لیے وہ سبب فخر و مباہات ہیں۔ اخلاقی قدریں ان کے نزدیک مخنثین کی کمزوریاں ہیں! اُن کے اندر گناہ و ثواب، خیر و شر، نیکی و بدی اور ہدایت و ضلالت کا امتیاز ہی سرے سے باقی نہیں رہا!

دُنیا میں خوش حالی اور آسودگی کون نہیں چاہتا، راقم الحروف نے فانی بدایونی اور جگر مراد آبادی کو بہت قریب سے دیکھا ہے، یہ حضرات بھی دنیوی منافع سے بے نیاز نہیں تھے مگر انھوں نے مالی فوائد کے لیے اسکیمیں نہیں بنائیں اور اس جدوجہد اور دوڑ دھوپ میں زمین کا گز نہیں بن گئے ——— مگر جوش صاحب کا معاملہ برعکس ہے، وہ مالی فوائد حاصل کرنے میں بہت ہوشیار اور دیدہ در بلکہ پھنکیت واقع ہوئے ہیں، جہاں بھی جس سے جتنا فائدہ پہنچ سکتا ہے اُس سے فائدہ حاصل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے اور یہ سب کچھ کرکے بھی وہ دنیا کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ دنیا کے پردے پر اُن سے بڑھ کر خود دار، مال و دولت کا ٹھکرانے والا ارباب جاہ و دولت سے بے نیاز کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔ جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں تفصیل دی ہے (ص۲۹۵) کہ انھوں نے پاکستان آکر کس محکمہ اور کس کس ذریعہ سے کیا کیا حاصل کرنے کی کوشش کی، زمین ہے، پٹرول پمپ ہے، سائیکل رکشاؤں کا پرمٹ ہے، کولڈ اسٹوریج، ٹیکسٹائل، پریس، مچھلی کی تجارت، بیڑی کے پتوں کا لائسنس، کارخانہ کے لیے اجازت نامہ، کنٹرول ریٹ پر لیس۔۔۔ یہ فہرست ۱۹ تک پہنچتی ہے جس میں فریئر ہال کے ایک گوشے میں ریسٹوران کھلوا دینے کی جدوجہد بھی شامل ہے، مگر وہ لکھتے ہیں انہیں مسلسل ناکامیاں ہوئیں ۔۔۔۔ اردشیر علی بھیم جی صاحب، جن کے نام سے "یادوں کی برات" کا انتساب کیا ہے، ان کو جوش صاحب نے اپنا محسن دوست لکھا ہے۔ "فتوحات" کا یہ سلسلہ عہدِ انگریز کی ریاستوں کے وظائف سے لے کر "طلوعِ فکر" اور "یادوں کی برات" کی اشاعت تک پہنچتا ہے[1]۔

جوش صاحب نے کتاب میں کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے کہ "علم و عقل" کی لگن

---

[1] گزشتہ سہ سالہ دورِ حکومت میں جوش صاحب نے حسبِ عادت حصولِ معاش و منفعت کے لیے جو کوششیں کی ہیں اور اسلام آباد کے مسلسل طواف کیے ہیں اس کی تفصیل کے لیے جوش صاحب کی دوسری کتاب کا شاید انتظار کرنا ہوگا۔ (م۔ق)

اُن کے اندر رہی ہے ـــــ اور اُن کی زندگی کے چار بنیادی میلانات یہ ہیں :۔
" شعر گوئی، عشق بازی، علم طلبی اور انسان دوستی "
لیکن پوری کتاب میں دو چار صفحوں پر تو ضرور عامۃ الورود سُنے سُنائے علمی مسائل کی کچھ جھلکیاں آ گئی ہیں مگر باقی صفحات " علم " کے بارے میں کورے ہیں! جوش صاحب نے لکھا ہے کہ اُن کے والد نے عربی کی تعلیم کے لیے ایک معلّم کو مقرر کیا، مگر انہوں نے عربی میں کیا پڑھا کسی ایک ابتدائی کتاب ـــــ میزان الصرف و منشعب تک کا نام نہیں لکھا! ساڑھے سات سو صفحے کی کتاب میں ایک باب تو ایسا ہونا چاہیے تھا جس میں وہ اپنی علم طلبی اور کتابی مطالعہ کی کچھ جھلکیاں دکھا دیتے! دارالترجمہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) جس میں وہ " ناظر ادب " رہے ہیں اسی کا اجمالی تعارف ہی کرا دیتے اور فلسفہ و منطق اور دوسرے علوم کے مصطلحات کے اردو تراجم کے کچھ اقتباسات اور نمونے پیش فرما دیتے، یہ بڑے کام کی چیز ہوتی! مگر یہ کام وہ اُسی وقت کر سکتے تھے جب اُن کا علمی مزاج ہوتا اور حصول علم کے لیے انہوں نے ریاضت و مشقت کی ہوتی! نثر و نظم میں اُن کی ذہانت کی جلوہ گری تو ملتی ہے مگر " علم " نہیں ملتا! ذہانت و بصیرت اور صحتِ فکر کے ساتھ علوم و معارف کی فراوانی تو علامہ اقبال ؒ کے یہاں پائی جاتی ہے۔

اُن کے مشاہدہ و مطالعہ اور علم و تفکّر کا حاصل یہ ہے کہ جوش صاحب نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں تذبذب، تشکیک، اور انکار کا موقف اختیار کیا ہے، دینی روایات اور اخلاقی اقدار کا وہ مذاق اڑاتے ہیں مگر یہودی مفکر کارل مارکس کو زمین کا پیغمبر سمجھتے ہیں! کتنی بڑی محرومی اور المناک بدتوفیقی اُن کو میسر ہوئی ہے ـــ!
جوش صاحب سے جب بھی میری ملاقات ہوتی ہے قریب قریب ہر ملاقات میں ان کے اس ملحدانہ موقف پر ٹوکتا رہتا ہوں! اردو میں ایک کتاب کا ترجمہ ہوا ہے جس میں یورپ کے اونچے درجہ کے چالیس سائنس دانوں اور ارباب علم و تحقیق کے مضامین ہیں، ان علماء نے سائنسی تجربہ و مشاہدہ کے بعد اللہ تعالیٰ کے وجود کا اقرار

کیا ہے ـــــ کئی برس ہوئے یہ کتاب میں نے جوش صاحب کے پاس بھجوائی تھی، جب ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے اس کتاب سے دودھ کی بو آتی ہے! دین کے بارے میں خالص عقلی دلائل کے ساتھ سنجیدہ طور پر گفتگو کرنے سے وہ ہمیشہ گریز کرتے ہیں اور علمی مسائل کو ہنسی مذاق میں اڑا دیتے ہیں۔

" یادوں کی برات " جوش ملیح آبادی کی خود اپنی بڑائی، خودستائی اور عظمت پندار کا شاندار قصیدہ ہے! شدید مبالغہ آرائی، سخن[۲] سازی، واقعات کی ملمع سازی اور تحریف سے لے کر صریح کذب[۳] وافترا تک کی اس کتاب میں بہتات ہے!! " یادوں کی برات " کے بارے میں عام تاثر نفرت انگیز ہے، یہ کتاب لکھ کر شاعر انقلاب نے خود اپنی شخصیت اور ذات پر ظلم کیا ہے! مگر جوش صاحب مسرور و مطمئن ہیں:ـ

؎ شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

(" فاران " فروری ۱۹۷۲ء)

[۱، ۲، ۳] شاعر انقلاب نے رائی کا پربت اور پر کا کوا بنانے میں اپنا پورا زور قلم صرف کیا ہے اور " ایجاد بندہ " کے جو نمونے پیش کیے ہیں اس پر تفصیل سے جرح و تنقید کی جائے تو یہ تبصرہ پوری کتاب بن جائے گا۔ طوالت سے بچنے کے لیے نہ جانے کتنے مقامات نظر انداز کر دیئے گئے، پھر بھی ۲۹ صفحے اس تبصرے کی نذر ہو گئے! ـــــ قاضی خورشید احمد کی زود گوئی کے بارے میں جوش صاحب لکھتے ہیں: ـــــ

" جب کبھی ان کے کالج میں کوئی مشاعرہ ہوتا تو وہ ایک نشست میں ہزار پندرہ سو شعر کہہ کر کالج کے لڑکوں میں تقسیم کر دیتے۔" (صفحہ ۴۲۴-۴۲۵)

قاضی خورشید احمد کی زود گوئی بلکہ ارتجالاً شعر گوئی اپنی جگہ مسلم! مگر جوش صاحب ہزار پندرہ سو کی بجائے " ڈیڑھ سو دو سو اشعار " لکھ سکتے تھے! ہزار بارہ سو اشعار کہنے اور کاغذ پر لکھنے کے لیے کتنا وقت چاہیے اور وہ بھی ایک نشست میں! پھر ایک غزل میں نو اشعار ہوں تو یہ بارہ سو اشعار ایک سو تیس لڑکوں پر تقسیم ہو سکتے تھے! کالجوں اور اسکولوں کے مشاعروں میں تمام کے تمام شعراء

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) طلباء ہی تو نہیں ہوتے ! پھر قاضی صاحب کے کالج میں کیا ایک مشاعرہ تین رات مسلسل ہوتا تھا ...... !

اپنی والدہ محترمہ کے بارے میں لکھتے ہیں :

"میرے نانا ہر چند بہت معمولی لکھے پڑھے آدمی تھے، لیکن یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ انہیں اپنی بیٹی اور بیٹے کی تعلیم و تربیت میں بڑا غلو تھا ......" (ص ۳۶۶)

"ان کو پوری سَو تک گنتی بھی نہیں آتی تھی اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ روپے میں کتنے پیسے اور آنے ہوتے ہیں ....." (ص ۳۶۹)

کیا کوئی عقل باور کر سکتی ہے کہ جس خاتون کی تعلیم و تربیت میں غلو کیا گیا ہو اور استانی اور مغلانیاں جن کی تعلیم و تربیت کے لیے بطورِ خاص ملازم رکھی گئی ہوں ان کو سَو تک کی پوری گنتی بھی نہ آتی ہو ! یہ جھوٹ جوش صاحب نے اس لیے بولا ہے کہ ان کی ماں کا بھولپن ثابت ہو اور انہوں نے جو یہ بات کہی ہے ۔ "ان کی خاص مغلانیاں ...... ان سے مہینے میں دو دو اور کبھی کبھی تین تین تنخواہیں وصول کر لیتی تھیں ۔" اس کے لیے جواز کی کوئی صورت پیدا ہو یا نہ ہو مگر یہ بات لکھ کر جوش صاحب نے اپنے خاندان کی نوابی کے کر و فر اور ٹھاٹ باٹ کی قلعی کھول دی ۔ جن امراء اور رئیسوں کے یہاں درجنوں کارندے، گماشتے نوکر اور نوکرانیاں ہوتی ہیں، ان کو تنخواہ ریاست کا خزانچی دیتا ہے، رئیس یا رئیسہ، تعلقدار یا تعلقدارنی نہیں دیا کرتیں ! جوش صاحب کی والدہ محترمہ کا مغلانیوں کو تنخواہ دینا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان کے یہاں گنتی کے چند ملازم ہوں گے ۔ درجنوں ہرگز نہ تھے جن کی لمبی چوڑی فہرست جوش صاحب نے درج فرمائی ہے ! اور ملازموں، خادموں اور نوکرانیوں کی اتنی قسمیں گنائی ہیں جو کسی والیٔ ملک کے یہاں ہو سکتے ہیں —— !

اپنے محترم دادا کے بارے میں لکھتے ہیں :

"ان کی پچیس تیس بیویاں، چار نکاحی، اور باقی سب لونڈیاں باندیاں تھیں، وہ ایک سو بارہ بچوں کے باپ تھے ۔" (ص ۲۵۳)

یا للعجب ! جوش صاحب کے اہلِ خاندان اور اسلاف کا دامن اس مبالغہ و کذب سے پاک ہے یہ تو جوش صاحب کی افسانہ سازی ہے !